ہدیہ امامیہ مشن لکھنؤ

امامیہ مشن لکھنؤ کا اکسٹھواں رسالہ ۶۱

(رجسٹرڈ)

خلافت و امامت

حصہ پنجم

مطبوعہ سرفراز قومی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

محصول ڈاک ۸

نگارشاتِ امامت

حصۂ پنجم

مطبوعہ سرفراز قومی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

آپ مذہب کی حمایت کیونکر کرسکتے ہیں؟

(۱) امامیہ مشن کی ممبری قبول فرما کر۔

(۲) امامیہ مشن کے استقلال فنڈ کے ٹکٹ خرید فرما کر۔

(۳) امامیہ مشن کے تبلیغی رسائل خرید فرما کر۔

جس سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا اور مشن کی امدا
بھی ہو جائے گی

(۴) امامیہ مشن کے تبلیغی رسائل ہم سے رعایتی قیمت پر خرید فرما کر
غیر مذاہب میں مفت تقسیم کر کے (جیسا کہ بعض ہمدردان ملت عامل ہیں)
امامیہ مشن ا۱ تبلیغی رسائل چھ سال کے اندر اندر شائع کرچکا
ہے جس کی کل تعداد ۸۵ ہزار سے اوپر ہو چکی ہے۔

ہر سال عشرہ ماہ محرم میں اردو، ہندی، انگریزی رسائل
غیر مذاہب میں مفت تقسیم کرتا ہے لکھنؤ کی اچھوت کانفرنس میں
دو زبانوں میں مفت رسائل تقسیم کئے ہیں۔

خادم (مذہب)
آنریری سکریٹری امامیہ مشن۔ نخاس لکھنؤ

امامیہ مشن کی اٹھسٹھویں خدمت ۱۱۶

خلافت و امامت حصہ پنجم

اس کے پہلے "خلافت و امامت" کے چار حصے شائع ہو چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے آخری "آزاد خیال شیعہ" کا مضمون تھا جس کی پہلی قسط نگار نے شائع کی تھی اور وہ امامیہ مشن کی جانب سے حصہ چہارم میں پیش کی گئی۔ اس کے بعد کسی مصلحت سے نگار میں اس کی دوسری قسطیں شائع نہیں ہو سکیں لیکن معزز اخبار سرفراز نے اُس کی دوسری قسط کو آزاد خیال شیعہ سے حاصل کر کے رجب نمبر میں شائع کیا۔ پھر بھی وہ مضمون مکمل نہ ہو سکا تھا۔ اب ہم نے "آزاد خیال شیعہ" سے اُس کے بقیہ حصہ کو بھی حاصل کر لیا ہے اور اس حصہ میں یہ پورا مضمون شائع کیا جاتا ہے۔ والسلام

خادم ملت

سید ابن حسین نقوی آنریری سکریٹری

نخاس۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسئلہ خلافت و امامت

استحقاق خلافت کے کیا شرائط ہیں اور

کیا وہ خلفائے ثلاثہ میں موجود تھے اور حضرت علی میں مفقود؟

(ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے)

اس بحث کے سلسلہ میں پہلے خلافت کے مفہوم پر بحث کی جائیگی اور پھر اُس کے شرائط پر روشنی ڈالی جائیگی۔

خلافت کا مفہوم "خلافت" کے معنی شیعی نقطۂ نظر سے یہ ہیں کہ "کسی شخص کا رسول کے بعد بحیثیت جانشین امام یعنی پیشوائے خلق ہونا"۔ امامت کے معنی لغت میں بھی پیشوائی ہی کے ہیں۔ شیعہ بھی اس لفظ کا اطلاق اسی معنی میں کرتے ہیں۔ بیشک وہ پیشوائی مطلق کا درجہ کسی کو بغیر انتخاب آلہی کے دنیا میں صحیح نہیں سمجھتے ہیں اور اسی لئے

"امامت" اُن کے نزدیک "رسالت" و "نبوت" کی طرح کا ایک منصب ہے جو خدا کی طرف سے کسی ہستی کو عطا ہوتا ہے۔ وہ ہستی کبھی اس کے ساتھ نبی و رسول بھی ہوتی ہے جیسے حضرت ابراہیم (انی جاعلك للناس اماما) اور کبھی بحیثیت خلیفۂ رسول اس منصب پہ نامزد ہوتی ہے۔

امامت کے لئے "م - ح" صاحب نے مذہب شیعہ کی طرف جو خصوصیات منسوب کئے ہیں کہ امامت ساری دنیا میں صرف قریش کے لئے مخصوص ہے اور پھر قریش میں سے بھی صرف بنی ہاشم کے لئے اور بنی ہاشم میں سے بھی صرف علی اور اولاد علی کے لئے الخ

اس پر تفصیلی تبصرہ بزمی صاحب کے ارشادات کے جواب میں اس کے پہلے ہو چکا ہے اور بتلایا جا چکا ہے کہ مذہب شیعہ کی تشریح کس غلط طریقہ پر کی گئی ہے۔

امامت کو نبوت کا ترکی بہ ترکی جواب قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی غیر مسلم کہے کہ مسلمانوں کے یہاں نبوت۔ الوہیت کا ترکی بہ ترکی جواب ہے کیونکہ جس طرح اللہ پہ ایمان لانا لازم ہے اُسی طرح رسول پر ایمان (آمنوا باللہ و رسولہ)

جس طرح اللہ کی اطاعت واجب ہوتی ہے اُسی طرح رسول کی اطاعت (اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول)

جس طرح اللہ کی معصیت ناجائز ہے رسول کی بھی معصیت اسی طرح حرام

(ومن یعص اللہ و رسولہ ویتعد حدودہ یدخلہ نارا خالدا فیہا)

اللہ کے لئے ولایت ثابت ہے اسی طرح رسول کے لئے۔ (انما ولیکم

اللہ و رسولہ)

اللہ سے منازعت ناجائز اور رسول سے بھی منازعت ناجائز۔

(ومن یشاقق اللہ و رسولہ فان اللہ شدید العقاب)

اللہ کی دعوت پر لبیک کہنا واجب اور رسول کی بھی۔

(یا ایہا الذین امنوا استجیبوا للہ وللرسول)

اللہ کی خیانت حرام رسول کی بھی خیانت حرام (لا تخونوا اللہ و

الرسول)

اللہ کی حرام کردہ باتوں سے پرہیز لازم۔ رسول کی بھی حرام کردہ

چیزوں کی پابندی لازم۔

(قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الاخر ولا یحرمون

ما حرم اللہ و رسولہ)

خدا نعمتوں کا عطا کرنے والا رسول بھی نعمتوں کے عطا کرنے والے

(ولو انہم رضوا ما اتاہم اللہ و رسولہ وقالوا حسبنا اللہ سیوتینا

اللہ من فضلہ و رسولہ) دوسری جگہ (وما نقموا الا ان اغناہم اللہ

ورسولہ من فضلہ)

اللہ کو رضامند کرنا لازم ۔ رسول کو بھی رضامند کرنا ضروری۔

(واللہ ورسولہ احقّ ان یرضوہ ان کانوا مؤمنین)

اللہ اعمال کا نگراں ہے۔ رسول بھی اسی طرح اعمال کے نگراں ہیں

(وسیری اللہ عملکم ورسولہ)

اللہ کے لئے عزت ہے اور رسول کے لئے بھی اُسی طرح عزت حاصل

ہے (للہ العزۃ ولرسولہ)

ترازو کے ایک پلّہ میں نبوت ہے اور دوسرے میں الوہیت ۔ مذہب

اسلام تول رہا ہے اور دونوں پلے برابر ہوتے ہیں ۔

پھر اگر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے اس لئے کہ رسول پر ایمان، رسول کی اطاعت، رسول کی ولایت، رسول کی محبّت، رسول کی عزّت جو کچھ بھی ثابت ہے وہ اللہ کے رسول ہی ہونے کی حیثیت سے ہے اس لئے وہ اللہ کے ہم پلّہ نہیں قرار پا سکتے تو اسی طرح امام کی اطاعت، پیروی جو کچھ بھی لازم ہے وہ خلیفۂ رسول ہونے کی حیثیت سے اس لئے امام اپنے پیشرو رسول سے بالکل مساوی کسی طرح قرار نہیں پا سکتے معصوم اور مفترض الطاعۃ ہونے سے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ ائمہ رسول کے برابر ہو جائیں کیونکہ انبیائے سابقین سب معصوم تھے اور اس میں بھی کیا شبہ کہ ہر ایک اپنے زمانہ

میں مفترض الطاعۃ بھی تھا لیکن پھر بھی قرآن مجید میں موجود ہے تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض (ان پیغمبروں میں بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے) اور مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے کہ ہمارے پیغمبر تمام دوسرے انبیا سے افضل تھے۔

اسی طرح رسول کے درجۂ نبوت کے خصوصیات وہ رسول کے ساتھ مخصوص ہیں ہرگز ائمہ کے لئے حاصل نہیں ہیں پھر بھی ہر امام کی اطاعت اُس کے زمانہ میں خلق خدا پر اُسی طرح واجب ہے جس طرح رسول کی اطاعت۔ اور چونکہ احکام رسول کے حقیقی علم کا ذریعہ ہر زمانہ میں وہ امام ہی ہے اس لئے ما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا پر عمل کی ہر زمانہ میں یہی صورت ہوسکتی ہے کہ ما اٰتاکم الامام فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا اور یہ قانون برابر ہر امام کے لئے ثابت ہے (وکذالک یجری لائمۃ الھدی واحد بعد واحد)

امام کے لئے تشریع احکام کا اپنی جانب سے ہرگز حق نہیں ہے لیکن باعتبار مصالح جزئیہ وضروریات وقتیہ قوانین کلیہ کے تحت میں بہت سی حلال باتیں عارضی طور پر حرام اور بہت سی حرام چیزیں بطور کلیہ عارضی طور پر حلال ہوسکتی ہیں اس کا نگران اپنے وقت میں امام ہی ہے۔ اس سے ہرگز امام کی مساوات یا افضلیت رسول سے ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ درجہ تو ایک ناقص حد تک عام مجتہدین کے لئے بھی حاصل ہے چہ جائیکہ امام۔

چونکہ ائمہ ترجمان رسول ہیں اور رسول ترجمان خدا اس سلئے کیا شبہہ

کہ " امام پر اعتراض کرنے والا اُن کے کسی حکم کی بابت مثل اُس کے ہے جو خدا اور رسول پر اعتراض کرنے والا ہے اور امام کی رد کرنے والا ویسا ہی جیسے اُس نے خدا کی بات کو رد کیا"۔

شیعہ چونکہ امامت کے مسئلہ کو خدا و رسول کی جانب سے سمجھتے ہیں اس لئے کوئی قابل تعجب امر نہیں کہ وہ اس کے اقرار کو جزو ایمان قرار دیں یا رکن مذہب سمجھیں کیونکہ وہ (ما انزل الی النبی) میں داخل ہے جس پر ایمان ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ مگر حیرت کے لائق ہے یہ کہ خلافت کے مسئلہ کو خدا و رسول سے بالکل غیر متعلق قرار دیکر بھی اُس کو مذہبی حیثیت سے انتہائی اہمیت دی جائے اور مدار نجات قرار دیا جائے۔

ملاحظہ ہو علامہ ابن حزم کی کتاب " المحلی " مطبوعہ مصر ج ا ص۴۵

لا یجوز ان یکون فی الدنیا الا امام واحد فقط ومن بات لیلة ولیس فی عنقه بیعة مات میتة جاهلیة

" دنیا میں بس ایک ہی امام ہو سکتا ہے اور جو شخص ایک رات بھی گذارے اس حالت میں کہ اُس کی گردن میں کسی امام کی بیعت نہیں ہو تو وہ جاہلیت (کفر) کی موت مریگا"۔

اب اس خلافت کا جاہ و جلال دیکھنے کے قابل ہے جو اپنے ہی ہاتھوں کی تراشی ہوئی ہے مگر اُس کی عمارت کا کاخ بلند نبوت و رسالت سے ٹکرا رہا ہے

اور احکام خدا میں تغیّر کا اختیار بھی بعض علمائے اہلسنت نے خلفاء کو دے ہی ڈالا چنانچہ علّامہ ابن قیم زاد المعاد فی ہدی خیر العباد (مطبوعہ مصر ج ا ص ۲۴۳) میں مسئلہ متعہ پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

فان قیل فما تصنعون بما رواه مسلم فی صحیحہ عن جابر بن عبد اللہ قال کنّا نستمتع بالقبضۃ من التمر والدقیق الایام علی عھد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم وابی بکر حتّی نہی عنہا عمر فی شان عمرو بن حریث وفیما ثبت عن عمر انّہ قال متعتان کانتا علی عھد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم انا انھی عنھما متعۃ النساء ومتعۃ الحج قیل النّاس فی ھذا طائفتان طائفۃ تقول ان عمر ھو الذی حرمھا ونھی عنھا وقد امر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم باتباع ما سنّہ الخلفاء الرّاشدون۔

"اگر کوئی دریافت کرے کہ کیا صورت کرو گے اُس روایت کے متعلق جو مسلم نے اپنی صحیح میں جابر بن عبد اللہ سے نقل کی ہے کہ ہم ایک مٹھی خرمے اور آٹے کے عوض میں برابر متعہ کرتے رہے جناب رسالتمآب اور پھر ابوبکر کے زمانہ میں یہانتک کہ عمر نے اُس سے ممانعت کی عمرو بن حریث کے معاملہ میں اور اُس روایت میں جو حضرت عمر سے منقول ہے کہ اُنھوں نے کہا کہ دو متعے عہد رسول میں تھے اور میں اُن سے ممانعت کرتا ہوں۔ ایک متعہ النساء

اور دوسرے متعہ الحج؟ تو جواب میں کہا جائیگا کہ لوگ اس کے متعلق دو حصوں پر منقسم ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ حضرت عمر ہی وہ ہیں جنھوں نے متعہ حرام کیا اور اس سے ممانعت کی اور جناب رسالتمآب نے حکم دیا تھا خلفائے راشدین کے احکام پر عمل کرنے کا اور اُن کی سنتوں کے اتباع کا۔"

حضرات اہلسنت نے خلافت کی تعریف اپنے مذاق پر کی ہے (شرح مواقف مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ص ۷۲۹)

قال قوم من اصحابنا الامامۃ ریاسۃ عامۃ فی امور الدین و الدنیا لشخص من الاشخاص ــــ ونقض ھذا التعریف بالنبوۃ و الاولی ان یقال ھی خلافۃ الرسول فی اقامۃ الدین وحفظ حوزۃ الملۃ بحیث یجب اتباعہ علی کافۃ الامۃ۔

ہمارے بعض علماء نے کہا ہے کہ "امامت" ہمہ گیر حکومت ہے دین و دنیا کے تمام امور میں کسی خاص شخص کے لئے اشخاص میں سے ــــ اس پر اعتراض ہوا ہے کہ اس میں نبوت داخل ہو جاتی ہے اور بہتر یہ تعریف ہے کہ وہ رسول کی نیابت ہے دین کے قائم کرنے میں اور ملت کی اجتماعی مرکزیت کو محفوظ رکھنے میں اس طرح کہ اسکا اتباع تمام امت پر واجب ہو۔"

میرے گذشتہ مضمون کو پورا پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ میں نے خلافت کے مفہوم پر کوئی بحث نہیں کی ہے اور نہ کوئی اُس کی تعریف ازروئے اصطلاح شرعی

بیان کی ہے۔ لیکن "ہرنام" صاحب نے اپنے آخری مضمون میں جناب نیاز کے محاکمہ کے بعد لکھا ہے اس سلسلہ میں کہ خلافت کا تعلق مذہب کے ساتھ ہے یا نہیں یہ لکھا تھا کہ "خلافت کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ " النّیابۃ فی امور الدین والدنیا" تو اب مذہب کے ساتھ اس کا کھلا کھلا تعلق ہو جاتا ہے۔"

میں نے اپنے مضمون میں ہرنام صاحب کے اس استدلال کا صرف حوالہ دیا تھا۔ لیکن "م ح" صاحب نے بہت اطمینان کے ساتھ میری جانب نسبت دی ہے کہ "صاحب تبصرہ نے خلافت کی از روئے اصطلاح شرعی تعریف یوں بیان کی ہے کہ "ھی النیابۃ فی الدین والدنیا" خلیفہ امور دینی (مذہب) وغیر دینی (دنیوی) میں نبی کا نائب ہوتا ہے۔"

اس پر آپ نے دو ایراد فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ خلیفہ نبی کا نائب دین کے ایک شعبہ میں ہوتا ہے یعنی نشر و نفاذ احکام الٰہیہ میں۔ لیکن پہلا شعبہ یعنی اخذ احکام الٰہیہ۔ اس میں نائب نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ خلیفہ نبی کا امور دنیوی یعنی وظائف بشری میں نائب نہیں ہوتا۔

دیکھا جائے تو ہرنام صاحب کی تعریف شرح مواقف کی تعریف اور اس کے ایراد سے خلاصہ کے طور پر مستنبط تھی۔ میری رائے میں "ہرنام" صاحب کو بہت خوشی کے ساتھ یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ "نیابۃ عن النّبی" کے پہلے "ریاستہ عامتہ" کا جزو نظر انداز ہو گیا ہے تاکہ نیابت کا تعلق صرف اُس حیثیت سے

ساتھ ہو جائے جو رسول کو خلق کے ساتھ حاصل ہے اور اُس حیثیت کے ساتھ نہ ہو جو رسول کو خالق کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ رہ گیا دوسرا ایراد وہ بالکل بے محل ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ نیابت کا تعلق اُنھیں امور میں ہے جو نبی کے لئے بحیثیت نبوت ثابت ہیں۔ نہ وہ کہ جو اُن کی ذاتی حیثیت سے شخصی طور پر ثابت ہیں۔

بہرحال ہر نام صاحب کا استدلال اپنے مقام پر برقرار ہے کہ جب خلافت صرف دنیوی باتوں ہی میں نہیں ہے بلکہ دین کا جزو اُس کے ساتھ شریک ہے تو وہ مذہب کے شعبہ سے بے تعلق چیز نہیں سمجھی جا سکتی۔

اب سنئے کہ "م ح" صاحب نے خلافت کی کیا تعریف فرمائی ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ "خلافت و امامت بادشاہت کو کہتے ہیں لیکن ایسی بادشاہت جو قیام و استحکام دین کے لئے بہ نیابت پیغمبر ہو ورنہ خلافت نہ ہوئی صرف ملوکیت یا قیصریت ہو گی" ——— لیکن آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے کہ:-

" عملہ خلافت کی حیثیت بیک وقت پولیس اور فوج کی سی ہے کہ پولیس کا منصب صرف نفاذ احکام ہے اور فوج نام ہے اُن ہی احکام و قوانین کی محافظ طاقت کا لیکن پولیس اور فوج کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ

اسمبلی اور کونسل کے پاس شدہ قوانین میں دست اندازی کریں، عملۂ خلافت کی اسی حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ آج تک کسی فہم و دانش رکھنے والے نے یہ خیال ظاہر نہیں کیا کہ پولیس اور فوج میں صرف شاہی خاندان ہی کے افراد برسرکار ہوں کسی دوسرے کو حق نہیں کہ وہ اس شعبہ میں اپنی خدمات سے حکومت کو فائدہ پہونچا سکے۔

اب اس ژولیدہ بیانی کی بنا، پہ دیکھنے والا کیا سمجھے کہ خلافت، بادشاہت کا ایسا اعلیٰ عہدہ ہے یا پولیس اور فوج کا سا معمولی درجہ ہی۔ بہرحال مانئے کہ خلافت بادشاہت ہے لیکن اس کے ساتھ یہ چیز و دیکھنے کے قابل ہے کہ "قیام و استحکام دین کے لئے یہ نیابت پیغمبر ہو" ظاہر ہے کہ نیابت کا تعلق اُنہی حیثیتوں کے ساتھ ہو سکتا ہے جو "منوب عنہ" کے لئے حاصل ہیں۔ بادشاہت کو اگر ظاہری شان و شوکت، بہت و حشمت، طنطنہ و طمطراق کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اُس کا انبیاء میں پتہ بھی نہیں ملے گا اور اس لئے آپ دیکھیں گے کہ انبیاء کے زمانہ میں مختلف ملوک و سلاطین تخت سلطنت پر متمکن ہوتے تھے اور انبیاء اُن کے ساتھ کوئی تعرض نہ کرتے تھے بلکہ اپنے فرائض منصبی میں بطور خود مشغول رہتے تھے۔ انبیاء کی بادشاہت کا کوئی مفہوم اگر ہو سکتا ہے تو وہ مذہبی حیثیت سے "مفترض الطاعۃ" ہونا لیکن آگے چل کر آپ

دیکھیں گے کہ مضمون نگار اس حیثیت کی خلیفہ سے نفی کر دینگے فرماتے ہیں کہ "نبی کا خلیفہ دینی بادشاہ کی حیثیت رکھتا ہے وہ نبی کی طرح مفروض الطاعۃ یا نبی کا جملہ امور میں نائب نہیں ہوتا ہے"

اب دیکھئے کہ "مفروض الطاعۃ" نہ ہونے کے بعد اُس کی بادشاہت کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟ "یا دبدست" طالوت کا بحیثیت بادشاہ، نبی کی موجودگی میں مبعوث ہونا صاف اس امر کی دلیل ہے کہ نبی کی حیثیت بادشاہ کی حیثیت سے مختلف ہے۔ پھر آخر نیابت رسول کو بادشاہت کا مرادف سمجھ لینا کب صحیح ہو سکتا ہے؟

یہ بھی اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ بادشاہ دینی کا انتخاب بھی خدا کی جانب سے ہو تو عام افراد کو کوئی حق انتخاب کا باقی نہیں رہتا یہانتک کہ اُن لوگوں کا اختلاف کہ "انی یکون لہ الملک علینا ونحن احق بالملک منہ ولم یؤت سعۃ من المال" (یعنی) اُس کو کہاں سے بادشاہت کا حق ہم پہ ہو سکتا ہے درصورتیکہ ہم اُس سے زیادہ بادشاہت کے مستحق ہیں اور یہ کوئی مالدار شخص نہیں ہے" مسترد کر دیا جاتا ہے یہ کہکر کہ "ان اللہ اصطفٰہ علیکم" (خدا نے اُن کو تمھارے اوپر برگزیدہ کیا ہے)۔

لیکن رسول اللہ کی خلافت کے لیے مسلمان اس حق کو اللہ و

رسول سے سلب کر کے اپنے ہاتھ میں لے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا و رسول کی طرف سے اس امر میں مداخلت ہونا "عقل عمومی" اور "حاسئہ اجتماعیہ" کے خلاف اور اصول جمہوریت کے منافی ہے۔

"عملۂ خلافت کی حیثیت پولیس اور فوج کی ہے" لیکن آج تک کسی فہم و دانش رکھنے والے نے یہ خیال ظاہر نہیں کیا کہ پولیس اور فوج کے تقرر کا اختیار حکومت کو نہ ہو بلکہ عام پبلک اپنے اختیارات سے پولیس اور فوج کو مقرر کرے جو ظاہر ہے ایسے ہی افراد کو منتخب کرے گی جو اس کے ڈھب کے ہوں اور نہ اس پولیس اور فوج کی یہ ہمت ہو سکتی ہے کہ وہ فرائض کی انجام دہی میں کسی سخت گیری کی جرأت کرے کیونکہ وہ سمجھے گی کہ ہمارا عزل و نصب اسی عام خلقت کی رضا مندی سے وابستہ ہے۔

یہ کہنا کہ کسی فہم و دانش رکھنے والے نے یہ خیال ظاہر نہیں کیا کہ پولیس اور فوج میں صرف شاہی خاندان کے افراد برسر کار ہوں" یہ صحابۂ کبار اور بالخصوص حضرت ابوبکر و حضرت عمر کے فہم و دانش پر حملہ ہے اس لئے کہ جیسا گذشتہ تنقیح کے ذیل میں لکھا جا چکا ہے۔ یہ خیال سب سے پہلے ان ہی حضرات کا ظاہر کیا ہوا ہے اور اس کی نسبت حدیث حضرت رسول کی طرف دی گئی ہے

چلتے چلاتے ایک سند اس کی اور سن لیجئے۔

(محلی ابن حزم جلد ۱ مطبوعہ مصر ص۴۴)

ولا تجوز الخلافة الا فی قریش وھم ولد فھر بن مالک بن نضر بن کنانۃ الذین یرجعون بانسابھم الیہ حدثنا عبد اللہ بن یوسف ثنا احمد بن فتح ثنا عبد الوھاب بن عیسٰی ثنا احمد بن محمد ثنا احمد بن علی ثنا مسلم بن حجاج ثنا احمد بن عبد اللہ ثنا یونس ثنا عاصم بن محمد بن زید بن عبد اللہ بن عمر بن الخطاب عن ابیہ قال قال عبد اللہ بن عمر قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یزال ھذا الامر فی قریش ما بقی من الناس اثنان۔

"(یعنی) خلافت جائز نہیں ہے مگر قریش میں اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا سلسلہ نسب فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ تک پہونچتا ہے ——— (بسند متصل) عبداللہ بن عمر سے روایت ہے حضرت رسول نے فرمایا کہ ہمیشہ یہ امر (خلافت) قریش میں رہے گا جب تک کہ دنیا میں دو شخص بھی موجود ہوں"۔

علامہ ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ (مطبوعہ مصر ص) میں لکھا ہے

فی روایۃ ان ابابکرا حتج علی الانصار بخبر الائمۃ من قریش وھو حدیث صحیح ورد من طرق عن نحو اربعین صحابیا

"(یعنی) ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر نے انصار کے مقابلہ میں

استدلال کیا اس روایت سے کہ ائمہ قریش سے ہونگے اور یہ حدیث صحیح ہے

جو تقریباً چالیس صحابیوں کے طریق سے وارد ہوئی ہے۔

اب "م ح" صاحب کو اختیار ہے کہ اس شرط کو مہمل قرار دیں یا

خودساختہ اور عقل والے انسانوں کے باور کرنے کے قابل سمجھیں یا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جیسا ہرنام صاحب نے اپنے آخری مضمون میں لکھا

ہے اگر خلفائے ثلثہ کی خلافت کو کوئی مذہبی حیثیت عطا نہ کی جائے اور

اُنھیں صرف ایک مسلمان بادشاہ سمجھا جائے تو شیعی اور سنّی اختلاف باقی ہی

نہیں رہ سکتا۔

میں ہرنام صاحب کی نکتہ رسی کی قدر کرتے ہوئے اُن کی تحریر کا یہ

جزو اس موقع پر ضرور نقل کرونگا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"اس وقت مسلمانوں کے لئے مسئلہ خلافت کا عملی پہلو صرف اس

قدر ہے کہ وہ اپنے احکام و تعلیمات مذہبی میں کن پیشوایان دین کو اپنا

راہنما قرار دیں اور اُن کے تعلیمات پر عمل کریں؟

اگر یہ مسئلہ اس وقت بھی طے پا جائے اور تمام اہل اسلام متفقہ حیثیت

سے عترت رسول کی مذہبی پیشوائی کو قبول کرلیں اور احکام و تعلیمات مذہبی

میں اُن ہی کے تعلیمات کو مستند سمجھنے لگیں تو پھر کوئی سوال ہی باقی نہیں

رہتا۔ اس لئے کہ خلافت یعنی بادشاہت تو ایک وقتی چیز ہے جس کے

احکام انتظامی حیثیت رکھتے ہیں جن کا کوئی تعلق آیندہ نسلوں کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا اس لئے اگر حضرات خلفار کی حکومت کو اس حیثیت سے اُن کے زمانہ میں تسلیم بھی کیا جائے تو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ساتھ اُس کا کوئی عملی یا اعتقادی تعلق ثابت نہیں ہوتا اور اس لئے موجودہ زمانہ میں شیعہ اور سنی تفریق کا کوئی سبب باقی نہیں رہتا"

یہ اضطراب بیان کیا حقیقت رسی کا پتہ دیتا ہے کہ شروع میں خلیفہ کو امور دینیہ میں نبی کا نائب" بتلایا جاتا ہے اور یہ کہ اُس کا کام ہے نشر و نفاذ احکام الٰہیہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ رسول کی نیابت میں احکام شرعیہ سے امت کو آگاہ کرنے والا ہے اس کے لئے سب سے بڑی ضرورت ہے احکام شرعیہ کے علم کی۔

آگے بڑھ کر اُس کی حیثیت قرار دی جاتی ہے "بادشاہ" کی اور بتایا جاتا ہے کہ "اُس کا سب سے بڑا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ وہ قیام و بقائے دین کے لئے فرائض جہاد کو انجام دے، بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہئے کہ تحفظ اسلام کے لئے جو کوششیں ملکی اور بین الاقوامی حیثیت سے کی جا سکتی ہیں اُن ہی کا نام اسلام کے اندر" اسلامی سیاست" ہے خلیفہ اسی اسلامی سیاست کا نگراں ہوتا ہے اور بس۔

اسی بنا پر خلیفہ میں صرف اُن ہی امور کے موجود ہونے کی ضرورت ہے

جو بادشاہت کے لئے ضروری ہیں اور وہ طاقت وقوت ہے اور علم، مگر علم شریعت نہیں بلکہ علم سیاست۔

تیسری کروٹ میں خلیفہ کی حیثیت قرار دی گئی ہے پولیس اور فوج کی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سیاست بین الاقوامی کا نگراں نہیں بلکہ صرف انتظام داخلی کا محافظ اور کارگذار ہے۔

بہرحال اب وقت ہے اس کا کہ شرائط خلافت پر تبصرہ کیا جائے۔

شرح مواقف (مطبوعہ نولکشور ص۲۱) میں ہے۔

المقصد الثانی فی شروط الامامة الجمهور علی ان اهل الامامة ومستحقها من هو مجتهد فی الاصول والفروع لیقوم بامور الدین متمکنا من اقامة الحجج وحل الشبهة فی العقائد الدینیة مستقلا بالفتوی فی النوازل والاحکام والوقائع نصا واستنباطا لان اهم مقاصد الامامة حفظ العقائد وفصل الحکومات ورفع المخاصمات ولم یتم بدون هذا الشرط ذا رأی وبصارة بتدبیر الحروب والسلم وترتیب الجیوش وحفظ الثغور لیقوم بامر الملک شجاعا قوی القلب لیقوی علی الذب عن الحوزة والحفظ لبیضة الاسلام بالثبات فی المعارک کما روی انه علیه الصلوٰة والسلام وقف بعد انهزام المسلمین فی الصف قائلا

انا النبی لا کذب   انا ابن عبد المطلب

ولا سهولة ایضا فی اقامة الحدود وضرب الرقاب ———

یجب ان یکون عدلا فی الظاهر لئلا یجور فان الفاسق

ربما یصرف الاموال فی اغراض نفسه فیضیع الحقوق عاقلا

لیصلح للتصرفات الشرعیة والملکیة بالغا لقصور عقل الصبی

ذکرا اذ النساء ناقصات العقل والدین حرا لئلا یشغله خدمة

السید عن وظائف الامامة ولئلا یحتقر فیعصی فان الاحرار

یستحقرون العبید ویستنکفون عن طاعتها فهذه الصفات

معتبرة فی الامامة بالاجماع۔

ترجمہ۔ دوسرا مقصد بحث امامت کا شرائط امامت کے بیان میں ہے جمہور اس بات کے قائل ہیں کہ امامت کا مستحق وہ شخص ہے جو اصول عقائد اور فروع احکام دونوں میں مجتہد ہو تاکہ امور دینیہ کا انصرام کر سکے اور عقائد مذہبی میں دلائل قائم کرے اور شبہات کو حل کرے۔ مسائل اور احکام اور رونما ہونے والے واقعات میں نص صریح اور استنباط کی بنا پر بذات خود فتویٰ دے سکے اس لئے کہ امامت کے مقاصد میں سب سے اہم بات عقائد کی حفاظت ہے اور مقدموں کا فیصل کرنا اور اختلافات کا دور کرنا ہے اور یہ بغیر اس شرط کے

نہیں ہو سکتا۔ جنگ و صلح کے تدابیر اور لشکروں کی ترتیب اور سرحدوں کی حفاظت میں رائے اور نظر صائب رکھتا ہو تاکہ ملکی امور کو انجام دے سکے۔ بہادر قوی دل ہو تاکہ اسلام پر کوئی مصیبت آئے تو وہ اُسکے دفع کرنے پر قادر ہو۔ اور مرکز اسلامی کی حفاظت کی طاقت رکھتا ہو تاکہ اسلام اُس کو جنگ کے معرکوں میں پامردی کی بنا پر کھڑا کر سکے جیساکہ روایت میں وارد ہوا ہے کہ حضرت رسول تمام مسلمانوں کے شکست کھانے کے بعد بھی صف جنگ میں کھڑے رہے اور آپنے فرمایا۔

"میں نبی ہوں۔ کوئی جھوٹا شخص نہیں ہوں۔ میں عبد المطلب کا فرزند ہوں" اس کے علاوہ حدوں کا قائم کرنا اور گردنوں کا مارنا کوئی آسان کام نہیں ہے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بذاہر عادل ہو تاکہ بے انصافی نہ کرے کیونکہ فاسق شخص اکثر اموال کو اپنے ذاتی اغراض میں صرف کر دیگا تو حقوق ضائع ہونگے۔ عاقل ہو (یعنی دیوانہ نہ ہو) تاکہ تصرفات شرعیہ اور امور سلطنت کے قابل ہو سکے۔ بالغ ہو اس لئے کہ بچہ کی عقل ناقص ہوتی ہے۔ مرد ہو اس لئے کہ عورتیں عقل اور مذہب دونوں حیثیتوں سے ناقص ہیں۔ آزاد ہو تاکہ اپنے مالک کی خدمتگذاری اُس کو فرائض امامت سے مانع نہ ہو نیز اس لئے کہ اُس کو حقیر سمجھکر اُس کی نافرمانی نہ کی جائے کیونکہ آزاد لوگ غلاموں کو حقیر سمجھتے ہیں

اور ان کی اطاعت اپنے لئے ننگ خیال کرتے ہیں۔ یہ صفتیں وہ ہیں جو امامت میں باجماع معتبر ہیں"۔

عقائد نسفی میں لکھا ہے۔

یشترط ان یکون من اھل الولایۃ المطلقۃ الکاملۃ سائسا قادرا بعلمہ وعدلہ علی تنفیذ الاحکام وحفظ حدود دارالاسلام وانصاف المظلوم من الظالم

(ترجمہ) خلیفہ کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ کامل ولایت کے تمام خصوصیات رکھتا ہو یعنی مسلمان۔ آزاد مرد۔ عاقل اور بالغ ہو اور انتظام کی قابلیت رکھتا ہو اور اپنے علم اور عدالت کی بنا پر احکام شرعیہ کا اجرا اور دارالاسلام کے حدود کی حفاظت اور ظالم سے مظلوم کے انصاف پر قدرت رکھتا ہو"۔

علامہ ابن روزبہان کی عبارت اس کے پہلے درج ہو چکی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں" امام کہ جو اس منصب کا اہل اور مستحق ہو اُس کے شرائط یہ ہیں کہ وہ اصول و فروع میں مجتہد ہو تاکہ امور دین کو انجام دے سکے۔ جنگ کے تدابیر میں رائے اور نظر صائب رکھتا ہو۔ بہادر قوی دل ہو تاکہ مرکز اجتماعی سے مدافعت کر سکے۔ عادل ہو تاکہ ظلم و جور نہ کرے اس لئے کہ فاسق اکثر اموال کو اپنے ذاتی اغراض میں صرف

کر دیتا ہے اور عادل ہمارے نزدیک وہ ہے جو گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہ کرتا ہو اور صغائر پہ اصرار نہ رکھتا ہو اس کے ساتھ عادل ہو تاکہ تصرفات شرعیہ اس کے جائز ہوں بالغ ہو کیونکہ بچہ کی عقل ناقص ہوتی ہے۔ مرد ہو اس لئے کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں آزاد ہو اور قبیلہ قریش ہی سے ہو جس میں یہ سب صفتیں موجود ہوں وہ خلافت کے منصب کا مستحق ہوگا"۔

ان کلمات سے ظاہر ہے کہ خلافت میں سب سے زیادہ اہمیت علم شریعت اور مذہبی اصول و فروع میں قوت اجتہاد کو دی گئی ہے اور شارح مواقف نے تصریح کی ہے کہ "امامت کے مقاصد میں سب سے اہم بات عقائد کی حفاظت اور مقدموں کا فیصل کرنا اور اختلافات کا دور کرنا ہے"۔

شرح عقائد نسفی میں بھی اس کی تصریح موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں

فان قیل فلیکتف بذی شوکۃ یملک العامۃ سواء کان اماما او غیر امام فان انتظام الامور یحصل بذلک کما فی عہد الاتراک قلنا نعم یحصل بعض النظام فی الدنیا لکن یختل امر الدین وھو المقصود الاھم والعمدۃ العظمیٰ

(ترجمہ) اگر کہا جائے کہ کوئی شخص ایسا ہو جو جاہ و حشمت رکھتا ہو اور عام افراد پہ سلطنت کرے وہ کافی سمجھا جانا چاہئے خواہ امام

یا غیر امام، کیونکہ انتظام کا مقصد اس سے حاصل ہو جائیگا جیسا کہ ترکوں کے زمانہ میں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں اس سے دنیاوی معاملات کا تو کچھ انتظام ہو جائیگا لیکن دینی امور درہم و برہم ہو جائیں گے اور اہم ترین مقصد اور سب سے بڑا رکن یہی ہے

علامہ قوشجی نے شرح تجرید میں لکھا ہے:۔

انتظام امر عموم الناس علی وجہ یؤدی الی صلاح الدین والدنیا یفتقر الی ریاسۃ عامۃ فیھما اذ لو تعدد الرؤساء فی الاصقاع والبقاع لادی الی منازعات ومخاصمات موجبۃ لاختلال امر النظام ولو اقتصرت ریاستہ علی امر الدنیا لفات انتظام امر الدین الذی ھو المقصود الاھم والعمدۃ العظمیٰ۔

(ترجمہ) تمام لوگوں کے امور کے انتظام کے لئے اس صورت پر کہ دین و دنیا دونوں کی بہتری ہو ضرورت ہے کہ دین و دنیا دونوں میں ریاست عامّہ حاصل ہو اس لئے کہ اگر متعدد حاکم ہوں مختلف ممالک میں تو آپس میں لڑائیاں ہونگی جس سے انتظامات میں خرابی واقع ہوگی اور اگر اُس کی ریاست دنیاوی امور سے مخصوص ہو تو دین کا انتظام رہ جائیگا جو اہم مقصد اور سب سے بڑا رکن ہے"۔

ملاحظہ کیا آپ نے کہ یہ علمائے اسلام خلافت کے بارے میں بہت زیادہ زور علم دین و شریعت پر دے رہے ہیں اس لئے کہ ان کے نزدیک ملوکیت اور خلافت میں حدفاصل یہی ہے کہ اُس کا تعلق صرف امور دنیا سے ہوتا ہے لیکن اس میں مقصود اہم اور رکن اعظم "دین" ہوتا ہے

خلفاء کے صفات کا یہ پہلو اگرچہ ہماری بحث کا فیصلہ کن جزو ہونا چاہئے تھا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ چونکہ یہ مقابلہ بے انتہا غیر مبہم اور واضح ہے اس لئے "م ح" صاحب نے اس میدان میں اپنی جماعت کی شکست کو یقینی سمجھتے ہوئے اپنی رزمگاہ کا دوسرا میدان تلاش کیا ہے۔ اُنھیں علم دین و شریعت کے مسئلہ میں اتنی مایوسی ہے کہ وہ طالوت کی بادشاہت کے بارہ میں قرآن مجید کی آیت میں جو "علم و جسم" کی لفظ ہے اُس سے بھی فوراً خطرہ کا احساس کرتے ہوئے "علم" کے ساتھ اپنے ترجمہ میں بریکٹ کے اندر (سیاست) کی لفظ لکھ دیتے ہیں تاکہ علم شریعت کی ضرورت خلافت کے لئے ضروری نہ قرار پائے۔

اب دیکھئے کہ اُنھوں نے "امور استحقاق خلافت" کے ذیل میں کیا چیزیں پیش کی ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔ "وہی امور جو بادشاہت کے لئے ضروری ہیں اُن کی ایک شخص میں موجودگی اُس کو مستحق خلافت قرار دے گی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کون سے امور ہیں جو بادشاہت کے لئے ضروری ہیں کہ بغیر اُن کے کوئی شخص بادشاہ نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز ہم کو یہ نظر آتی ہے کہ سلطنت و حکومت کے لئے جابرانہ قوت اور قاہرانہ طاقت کا ہونا ضروری ہے جس میں قوت نہ ہو گی وہ کیا حکومت کر سکے گا اس طاقت کی دو صورتیں ہیں اوّل یہ کہ وہ جسمانی طور سے جسمانی قوت کافی رکھتا ہو۔ فنون جنگ و سپہ گری میں اُس کو مہارت تامّہ ہو اور عزم و ارادہ کی بھی اُس کے پاس غیر معمولی طاقت ہو اور طاقت کی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے عزم کا مضبوط اور ارادہ کا پکّا انسان ہو اور علم و تدبیر سے بھی بڑی حد تک بہرہ ور ہو تاکہ امور سیاست کی گتھیوں کو آسانی سے سلجھا سکے اور ملکی نظم و نسق کو عمدہ اسلوب پر قائم کر سکے۔ اگر کسی میں یہ دو صفات موجود ہیں تو وہ بادشاہت کر سکتا ہے ورنہ ناممکن ہے۔

"خلافت کا مستحق بھی وہی شخص ہو گا جس میں مذکورۂ بالا دو شرطیں موجود ہوں کیونکہ اُس کا مشن صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ احکام شرعیہ کا نفاذ کرے، حدود اللہ کو قائم کرے اور حفاظت بقاؤ دین کے لئے اگر ضرورت پیش آجائے تو مردانہ وار جنگ سے بھی دریغ نہ کرے، ان امور کی انجام دہی کے لئے ضرورت ہے کہ وہ پختہ کار انسان ہو۔ اُس کے عزائم میں اس قدر استقلال ہو کہ دوسری طاقتیں اُسے متزلزل نہ

کر سکتی ہوں، پرخطر مواقع میں اُس کے پاؤں نہ ڈگمگا سکتے ہوں، وہ ایسی کمزور ذہنیت کا مالک نہ ہو کہ مخالف آراء اُسے ہر موقع پر شکست دے سکیں، بلکہ سنجیدہ دل و دماغ رکھنے والا انسان ہو۔ فہم و تدبر اور فراست و دانائی سے کافی حصہ پایا ہو نڈر ہو اور بیباک پختہ خیال ہو اور راسخ العزم مشکلات کا دلیری کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ہمت و جرأت رکھتا ہو، لوگوں پر اس کی غیر معمولی طاقت کا اثر قائم ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے احکام دوسروں سے منوا سکتا ہو، ایسا شخص خلیفہ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور خلافت کا مستحق ہے"۔

صاحب تبصرہ نے بہت سمجھ بوجھ کر خلافت کے لئے بس دو شرطیں قرار دی ہیں ایک یہ کہ وہ جسمانی قوت رکھتا ہو اور فنون جنگ و سپہ گری میں اُسکو مہارت ہو۔ اور دوسرے اپنے عزم و ارادہ کا پختہ ہو۔ حالانکہ جناب بزمی صاحب بھی جو اپنے پہلے مضمون میں سیاست کے پہلو پر بہت کچھ زور دے چکے ہیں۔ خلیفۂ اسلام کے لئے صرف اسی کو کافی نہیں سمجھتے ہیں۔ بلکہ اُنھوں نے شرائط خلافت کو بہت ایجاز کے ساتھ حسب ذیل الفاظ میں منحصر قرار دیا ہے۔

"خلافت و امامت کے مسئلہ میں اگر بے تعصبی کے ساتھ ذرا سے غور سے بھی کام لیا جائے تو یہ حقیقت بے نقاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی

کہ نبی کریم کا صحیح جانشین وہی ہو سکتا ہے جو ایک طرف تو اخلاقی فضیلت میں دنیا تک کا مکمل ترین انسان ہو اور دوسری طرف سیاسی حل وعقد میں دنیا کا مہذب ترین فرمانروا"

(خلافت و امامت شائع کردہ امامیہ مشن لکھنؤ۔ حصہ اول ص۵)

امور استحقاق خلافت } اب گذشتہ تمام اقوال کو پیش نظر رکھ کر اگر خلافت کے شرائط پر نظر ڈالی جائے تو وہ حسب ذیل قرار پاتے ہیں۔

(۱) دین و شریعت کا کامل علم رکھتا یعنی اصول دین اور احکام شرعیہ میں استنباط کی قدرت رکھتا ہو تاکہ عقائد دینیہ میں جو شبہات واقع ہوں اور شرعی جو مسائل درپیش ہوں اُن سب کو حل کر سکے

(۲) تدابیر جنگ سے خوب واقف ہو اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھتا ہو۔

(۳) شجاع قوی دل ہو جس کا جنگ میں ثبات مسلمانوں کے لئے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا ہو اور نیز اجرائے حدود اور قصاص کے معاملہ میں اُس سے کمزوری کا اندیشہ نہ ہو

(۴) عادل ہو تاکہ اموال مسلمین میں تغلب و تصرف نہ ہونے پائے۔

یہ شرائط مستند علمائے اہلسنت کے بیان کردہ ہیں اور اسی کے ساتھ "م ح" صاحب کی خاطر سے بڑھا لیجئے کہ (۵) اپنے عزم کا مضبوط اور ارادہ کا پکا انسان ہو۔

اور بزمی صاحب کے نقطۂ نظر سے

(۶) اخلاقی فضیلت میں دنیا کا مکمل ترین انسان ہو۔

کیا حضرات خلفائے ثلثہ مستحق خلافت تھے

یہ گذشتہ بحث کا لازمی نتیجہ ہے شرائط خلافت جو اہلسنت کے نقطۂ نظر سے درج کئے گئے ہیں۔ آپ کے سامنے ہیں۔ ان امور کے لحاظ سے فہم و درایت کی روشنی میں دیکھئے کہ حضرات خلفائے ثلثہ میں کہاں تک خلافت کی استعداد و صلاحیت تھی۔

حضرت بزمی صاحب نے اپنے ابتدائی مضمون میں اس بحث کو اس طرح ختم کرنا چاہا ہے کہ

"دنیا کا عام اصول یہ ہے کہ جو شخص کسی عہدہ کو بغیر کسی قباحت کے انجام دے اسے اس عہدہ کا اہل سمجھا جاتا ہے اور اس لئے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی اہلیت میں تو کوئی شک ہونا ہی نہیں چاہئے"

اس پر مجھے اُس ایرانی کی نقل یاد آجاتی ہے جس نے کہا تھا۔

"می گویند نماز بے وضو نمی شود۔ من نماز بے وضو کردم و شد۔"

بندہ پرور! اصل محل بحث وہ حکومت ہے جو رسول کی جانشینی کے لحاظ سے مذہبی طور پر صحیح بھی ہو۔ اس کے لئے اگر وہ شرائط موجود نہیں ہیں جو ضروری قرار دئے گئے ہیں تو یہ تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ عہدہ

بغیر کسی قباحت کے انجام پا گیا ورنہ "کردم وشد" کی صورت پر تو یزید و ولید ایسے فاسق وفاجر بھی "امیر المومنین" بنے اور ہو گئے اور ایک غیر مسلم بھی اس عہدہ کو انجام دے سکتا ہے اور ہو جائیگا۔

(پہلی شرط)
دین شریعت کا کامل علم

افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ یہی شرط جو "مقصود اہم اور رکن اعظم" ہے ان حضرات کے کمالات کا سب سے زیادہ کمزور پہلو ہے۔ اُن کی واقفیت مسائل شرعیہ میں اُتنی بھی نہ تھی جتنی بہت سے عام صحابہ کی تھی اور اس کمزوری کا احساس خود آپ حضرات کو بھی تھا اس لئے برابر ایسے صحابہ کو مددگار رکھا جاتا تھا جو ان جھموں میں دستگیری کر سکیں۔

ایسے اتفاقات بھی ہوئے ہیں کہ فیصلہ غلط کیا اور کسی صحابی نے اعتراض کر دیا۔ فوراً فیصلہ بدل دیا اور اُس صحابی کے قول کے مطابق حکم دے دیا۔ حضرت ابوبکر کی خلافت کی مدت ہی کتنی تھی اور وہ بھی "فتنۂ ارتداد" اور "انتظام مملکت" کے جھگڑوں میں صرف ہوئی لیکن اس میں بھی بعض واقعات ایسے پیش آگئے جن میں آپ کو زحمت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس سلسلہ میں میراث جدّہ کا مسئلہ بہت مشہور و معروف ہے۔[۱] علامہ ابن تیمیہ نے "رفع الملام عن الائمۃ الاعلام" ص۱۲ میں لکھا ہے کہ جب آپ سے میراث جدّہ کے بارہ میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے اس

---

[۱] ملاحظہ ہو اسد الغابہ ابن اثیر جزری ج ۵ ص ۳۲۰ مطبوعہ مصر ۱۲۸۰

مسئلہ کا بالکل علم نہیں۔ ہاں میں لوگوں سے دریافت کرونگا۔ چنانچہ آپ نے دریافت کیا مغیرہ ابن شعبہ و محمد بن مسلم نے بتایا کہ رسول اللہ نے اس کو سدس عطا کیا ہے۔

قرآن مجید کی آیت "وفاکھۃ وابا" کے معنی میں آپ ہمیشہ متحیر رہے اور کبھی سمجھ میں نہ آئے۔[1]

چور کا بایاں ہاتھ کٹوا دیا۔ فجاءہ سلمی کو آگ میں جلوا دیا جس کے لئے علامہ قوشجی کو بھی تسلیم کرنا پڑا ہے کہ یہ آپ کی غلطی تھی۔ یہ آپ کے مختصر دور خلافت کے چند واقعات ہیں جو تاریخ نے اب تک پہونچائے ہیں۔ حضرت عمر جن کا دور اپنے "جبروت" کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس کا زمانہ بھی نسبتہً طولانی ہے۔ اس میں ان واقعات کی بہت کثرت ہے شیخ الاسلام ابن تیمیہ حرانی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر حسب ذیل مسائل کو نہ جانتے تھے۔

سنت استئذان۔ میراث دیت۔ حکم مجوس باعتبار جزیہ۔ انگلیوں کی دیت کے بارے میں آپ نے فیصلہ غلط کیا جسے معاویہ کو اپنے دور میں منسوخ کرنا پڑا اور مسلمانوں کو کوئی چارہ کار سوائے اس کے نہ ہوا کہ وہ معاویہ کے فیصلہ پر عمل کریں۔[2] کلالہ کے معنی کبھی آپ کی سمجھ میں نہ آئے۔ حالانکہ

---

[1] اتقان سیوطی مطبوعہ دہلی صفحہ ۱۶۴ [2] رفع الملام عن الائمۃ الاعلام صفحہ ۲۴۔

آپ نے سمجھنے کی کوشش بھی کی[۱] جو مسئلے آپ کو معلوم تھے وہ بھی آپ کو وقت پر یاد نہیں آتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص نے دریافت کیا کہ مجھے ضرورت غسل تھی اور پانی موجود نہ تھا فرمایا اس صورت میں نماز نہ پڑھو۔ عمار نے کہا کیا آپ کو یاد نہیں کہ ہم اور آپ ایک غزوہ میں گئے اور ہم کو غسل کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے تو نماز ہی نہیں پڑھی اور میں مٹی میں لوٹا اور نماز پڑھ لی۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ اس صورت میں خاک پر ہاتھوں کو مار کر چہرہ اور ہاتھوں کا مسح کر لینا چاہیئے[۲]۔ اس قسم کے مسلسل واقعات کا نتیجہ یہ تھا کہ مسائل شرعیہ میں آپ کے کسی حکم یا فیصلہ کا کوئی وزن عام نظروں میں باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ آپ نے اعلان کیا کہ عورتوں کے مہر میں کوئی زیادتی نہ کی جائے۔ اگر ایسا ہوگا تو زیادتی کی رقم بیت المال میں داخل کر دی جائے گی۔ ایک عورت نے کہا کہ یہ حکم خدا کے خلاف ہے اور قرآن کی آیت پڑھ دی تب آپ کو اعتراف کرنا پڑا[۳]۔ ابی بن کعب پر آپ نے قرآن کی کسی آیت کے بارہ میں اعتراض کیا انھوں نے فوراً کہہ دیا کان یلھینی القرآن و یلھیک الصفق بالاسواق میں رسول اللہ سے قرآن کا علم حاصل کرتا تھا اور آپ کو بازاروں میں خرید و فروخت کرنے سے فرصت نہ تھی۔

۱؎ اتقان مطبوعہ دہلی صہ ۳۱ ۲؎ محلّی جلد ۲ صہ ۱۵۵ ۳؎ اتحاف السادۃ المتقین فی شرح احیاء علوم الدین ج ۱ مطبوعہ مصر صہ ۲۸۹ رفع الملام عن الائمۃ الاعلام صہ ۴۹

وہ صاحبِ جلال انسان جو سعد بن ابی وقاص ایسے بڑے جرنیل کو اتنی سی بات پر کوڑا مار دے کہ وہ تعظیم کے لئے کھڑے نہ ہوئے تھے اور یہ کہے کہ "لم تھب الخلافۃ فاردت ان تعرف ان الخلافۃ لا تھابک" تم خلافت کی ہیبت سے متاثر نہیں ہوئے۔ میں نے چاہا تم کو بتلاؤں کہ خلافت بھی تم سے مرعوب نہیں ہوتی ۱؎ ایسا پرہیبت انسان علمی مسائل میں اس طرح کی باتیں سنتا ہے اور شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتا ہے۔ یہ اسی لئے کہ اس معاملہ میں خود آپ کا نفس اپنی عظمت کا قائل نہیں تھا۔ اسی لئے آپ مختلف صحابہ سے اس مرحلہ میں مدد حاصل کرتے رہتے تھے جن میں سے ایک ابی ابن کعب ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں۔

روی عنہ من الصحابۃ عمر فکان یسئلہ عن النوازل ویتحاکم الیہ فی المعضلات "اُن سے صحابہ میں سے حضرت عمر نے احادیث کی روایت کی ہے اور وہ اُن سے پیش آمدہ مواقع میں مسائل دریافت کیا کرتے تھے اور مشکل مقدمات کا اُن سے فیصلہ کراتے تھے ۲؎ یہاں تک کہ ابن عباس جو رسول اللہ کے زمانہ میں کمسن تھے اور انھوں نے صحابہ سے علم حاصل کیا تھا حضرت عمر کے ملجاؤ ماوی تھے

۱؎ صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص۔

۲؎ اصابہ جلد ۱ ص ۱۹۔

ابن اثیر جزری لکھتے ہیں:۔ ان عمر کان اذا جاءتہ الا قضیۃ المعضلۃ قال لابن عباس انھا قد طرت علینا اقضیۃ وعضل فانت لھا و لا مثالھا ثم یأخذ بقولہ

"جب حضرت عمر کے پاس مشکل مسائل پیش ہو جاتے تھے تو ابن عباس سے فرماتے تھے ہمارے پاس کچھ مقدمات اور دشوار مسائل آ گئے ہیں ان کا فیصلہ تمہیں کر سکتے ہو۔ پھر جو کچھ ابن عباس کی رائے ہوتی تھی اُس پر عمل کرتے تھے[۱]

یہ ابن عباس وہ تھے جو حضرت علیؑ کے شاگرد تھے اور اُنکا قول تھا کہ اذا جاءنا الثبت عن علی لم نعدل عنہ " جب کوئی حکم شرعی ہم کو علی کی جانب سے ثابت ہو جاتا تھا تو پھر ہم اُس سے عدول نہیں کرتے تھے"۔

پھر کیا تعجب ہے اگر حضرت عمر مسائل شرعیہ میں خود حضرت علی بن ابیطالب کی طرف رجوع کریں اور اُن کے احکام پر کاربند ہوں چنانچہ اس قسم کے واقعات بے شمار ہیں اور ایسے ہی مواقع پر آپ کی زبان سے یہ فقرہ نکلا تھا جو زبانزد خلائق ہے لولا علی لھلک عمر "اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا" اور اعوذ باللہ من معضلۃ لیس لھا ابوالحسن "خدا سے پناہ مانگتا ہوں اُس مشکل سے جس کے لئے ابوالحسن (علی بن ابیطالب) نہ ہوں"۔

تصدیق کے لئے ملاحظہ ہو امام ابن قتیبہ دینوری متوفی ۲۷۶ھ کی کتاب

[۱] اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۹۳

"تاویل مختلف الحدیث فی الرد علی اعداء اہل الحدیث" مطبوعہ مصر ۱۳۲۶ھ ص ۲۰۱۔
استیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ابن عبد البر قرطبی مالکی متوفی ۴۶۳ھ (مطبوعہ
حیدر آباد جلد ۲ ص ۴۷۲) اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ابن اثیر جزری۔ متوفی
۶۳۰ھ مطبوعہ مصر ج ۴ ص ۲۲۔ تہذیب التہذیب، حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی
۸۵۲ھ مطبوعہ حیدر آباد ج ۷ ص ۳۳۷، اصابہ حافظ ابن حجر ج ۲ ص ۵۰۹ شرح
نہج البلاغہ ابن ابی الحدید مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۶ ذخیرۃ المآل شہاب الدین
عبد القادر عجیلی۔ مطالب السؤل کمال الدین ابن طلحہ شافعی (مطبوعہ ایران)
ص ۱۳ مناقب اخطب خوارزم ص ۴۸۔ ملفوظات سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء
توضیح الدلائل شہاب الدین احمد۔ شرح قصیدہ تائیہ ابن فارض مولفہ
سعید الدین محمد بن احمد فرغانی۔ مطول سعد الدین تفتازانی مطبوعہ تبریز
ص ۱۳۶۔ فصول مہمہ ابن صباغ مالکی ص ۱۸ کفایۃ الطالب حافظ محمد بن یوسف
گنجی شافعی باب ۵۷۔ الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ شمس الدین ابن قیم
جوزیہ حنبلی مطبوعہ مصر ۱۳۱۷ھ ص ۴۶ مواقف عضد الدین الایجی۔ شرح مواقف
ابو العلی بن محمد رضا بخاری مطبوعہ لکھنؤ ۱۳۱۴ھ ص ۷۴۳ ابطال الباطل فضل اللہ
بن روزبہان شیرازی۔ شرح تجرید قوشجی۔ جواہر العقدین نور الدین سمہودی
صواعق محرقہ ابن حجر مکی مطبوعہ مصر ص ۷۶۔ اسعاف الراغبین محمد بن علی بن صبان
مصری برحاشیہ مشارق الانوار شیخ حسن حمزاوی مطبوعہ مصر ص ۱۵۲ تاریخ الخلفاء

حافظ جلال الدین السیوطی مطبوعہ مصر ص۶۶ نور الابصار سید مومن شبلنجی مطبوعہ مصر ص۲۳ ہدایۃ المرتاب حاج احمد آفندی مطبوعہ مصر ص۱۴۲ وغیرہ وغیرہ

مثل مشہور ہے الناس اعداء لما جھلوا ۔ بادشاہ وقت میں جتنا علمی ذوق اعلیٰ پایہ کا ہوگا اتنا وہ علوم وفنون کی ترویج کی طرف زیادہ متوجہ ہوگا لیکن دوسری صورت میں اس کے برعکس صورت پیدا ہونا یقینی ہے۔

یہ تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت عمر کے دور میں مسلمانوں کی علمی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا ہوئی ۔ خود آپ کے احادیث بہت کم تھی اس لئے کہ آپ کو اپنی قوت حافظہ پہ اعتماد نہیں تھا ۔ چنانچہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ کیا بات ہے آپ رسول اللہ کے کچھ احادیث بیان نہیں فرماتے تو ارشاد کیا انما اخشی ان ازید وانقص " مجھ کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کچھ زیادتی کمی نہ کر دوں[۱] ۔

اس کے باوجود آپ نے جرأت سے کام لے کر کبھی دو ایک حدیثیں ارشاد فرمائیں تو اُن میں بھی اشتباہ واقع ہو گیا ۔ ملاحظہ ہو صحیح بخاری باب ان المیت لیعذب ببکاء اھلہ ۔ حضرت عائشہ کے سامنے یہ حدیث جناب عمر کے انتقال کے بعد آپ کی زبانی بیان ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ عمر کو دھوکا ہوا یہ حدیث اس طرح نہیں تھی ۔

---

۱ حیوۃ الحیوان دمیری ج ا ص۲۸۲ ۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے اپنے زمانہ میں احادیث کی روایت سے ممانعت کردی تھی اور بہت سختی کرتے تھے چنانچہ اس مصیبت سے جناب ابوہریرہ کو بھی دوچار ہونا پڑا[۱]

اگر کتبخانۂ اسکندریہ کے جلانے کا واقعہ غلط بھی ہو تب بھی اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ آپ تصنیف و تالیف کے مخالف تھے اور مسلمانوں میں کتابت کے رواج ہی کو پسند نہ کرتے تھے اسی کا نتیجہ تھا کہ جمہور مسلمین تصنیف کے معاملہ میں پیچھے ہو گئے

مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی افسر مدرس مدرسۂ نظامیہ فرنگی محل نے "تدوین حدیث" ایک مضمون مسلم ایکاڈمی لکھنؤ کے جلسہ میں پڑھا تھا جو کتابی صورت سے شائع ہوا ہے اس میں آپ نے حدیث کی جمع و تالیف کے متعلق صحابہ میں جو اختلاف رائے تھا اسے تحریر فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"صحابہ مذہب میں بدعت سے اس قدر بچتے تھے کہ ادنیٰ ادنیٰ باتوں میں بدعت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ قرآن کی تدوین پر ایک گروہ صحابہ کو سخت اعتراض تھا۔ روایت حدیث پر سزا تک کی نوبت آئی - تدوین احادیث میں تو ایک یہی خرابی کا خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قرآن جو اس وقت تک موجودہ طور پر مکتوب نہیں تھا اور کلام حضرت رسالت پناہی مخلوط نہ

---

[۱] شرح ابن ابی الحدید جلد ا جزو۴ ص۲۲۴ -

ہو جائیں حضرت ابوہریرہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشہور ہے کہ اکثار حدیث پر سزا دی ہے ۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قاعدہ تھا کہ جب کسی کو والی مقرر فرماتے تو منجملہ دوسرے نصائح کے یہ بھی اس کو نصیحت فرماتے کہ دیکھو جن لوگوں کے پاس جا رہے ہو وہ قرآن پڑھنے میں مصروف ہیں اور شب روز اپنا وقت تلاوت قرآن میں صرف کرتے ہیں، اُن سے زیادہ حدیثیں بیان کر کے اُن کے ذہنوں کو تشویش میں نہ ڈالنا ۔غرض کہ جب روایت حدیث کی یہ صورت ہو تو تدوین وکتابت حدیث کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔"

پھر تحریر فرماتے ہیں "حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جمع حدیث کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی اور تمام صحابہ اس کو جمع کر دینے کی رائے ظاہر کر چکے تھے مگر قرآن کے ساتھ بے توجہی کے خوف نے اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مجبوراً باز رکھا تھا اور اس کے بعد ہم کو باوجود تلاش پھر کبھی صحابہ کا جمع کی جانب توجہ کرنا نظر نہیں پڑا ۔اگر کہیں احادیث کو بھی قرآن کی طرح خلفائے راشدین نے مدون کر دیا ہوتا تو یقین کیجئے کہ بہت کچھ کیا بلکہ قرآن کی طرح وہ بھی دست تصرف سے محفوظ ہو جاتے اور باہمی مسلمانوں میں کثیر فرقہ بندیوں کی زائد روک تھام ہو جاتی ۔آج احادیث میں جو جو شبہات اور شکوک اسناد اور الفاظ کے اختلاف کی وجہ سے پیش آئے ہیں وہ اُن کی تدوین و جمع کے بعد پیش نہیں آسکتے تھے ۔مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔"

امام مسلم نے بھی اپنی کتاب صحیح کے شروع میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے "اختلفوا فی کتابۃ الحدیث فکرہہا طائفۃ منہم عمر بن الخطاب" احادیث کے قلمبند کرنے کے بارے میں اختلاف ہوا ایک جماعت نے اس کو ناپسند کیا جن میں حضرت عمر ہیں"۔ عقائد کے معاملہ میں جو شبہات پیدا ہوتے تھے اُن کا حل علمی دلائل کے بجائے آپ کی جانب سے بزور "تازیانہ" کیا جاتا تھا امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم میں اس کی کافی تفصیل موجود ہے۔

رسالہ "حقائق" لکھنؤ میں شعبان ۱۳۵۲ھ میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں اس صورت حال پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا گیا ہے:۔ "وہ دور کس حد تک روشن کہے جانے کے قابل ہے جس میں معارف و حقائق کا چرچا نہ رہے فلسفہ الٰہیات اور علم کلام کے مسائل گوشہ گمنامی میں پڑ جائیں۔ تصنیف و تالیف کا دروازہ بند ہو اور روایت و احادیث پر سخت پابندیاں عائد ہوں کتب علمیہ کی چھان بین اور جستجو تو کجا علمی تحقیقات کے راستہ میں روڑے اٹکائے جائیں"۔ تفسیر قرآن کے متعلق ایک سوال پر سزائے تازیانہ دئے جانے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہبی سوال پر سختی و تشدد کسی طرح مناسب نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس سختی و تشدد کے بعد معترض کا یہ کہدینا کہ اُس کی تسکین ہو گئی اُس کے تسکین قلب کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس قسم کے طرز عمل سے عام افراد کو یہ خیال قائم کر لینے کا موقع مل سکتا ہے کہ سوال لاجواب تھا

اور سوائے مظاہرِ جبر و تشدد کے اس کا کوئی حل موجود نہ تھا۔"

اکثر ایسے موقعوں پر بھی آپ کا تازیانہ اُٹھ گیا جہاں کہنے والے نے ایک صحیح علمی بات اپنی زبان سے نکالی تھی۔ ملاحظہ ہو اتقان علامہ سیوطی مطبوعہ دہلی ص ۵۱۶۔

"ایک شخص نے حضرت عمر سے کہا کہ میں جانتا ہوں ایک آیت جو کتابِ خدا میں سب سے زیادہ سخت ہے آپ نے اُس کو دُرّہ لگایا اور کہا کہ تجھے بھلا اس کا علم کیسے حاصل ہوا۔ اچھا بتا وہ کیا ہے۔ اُس نے کہا "من یعمل سوءً یجز بہ" جو کوئی بھی کوئی برائی کریگا اُسے اُس کا بدلا دیا جائیگا۔ لہٰذا کسی کو ہم میں سے مطمئن نہ ہونا چاہئیے۔ جو کوئی گناہ ہم سے صادر ہوگا اُس کی پاداش ملیگی"

دیکھا آپنے یہ دُرّہ کس قصور پر اُٹھایا۔ کاش دریافت کرنے کے بعد یہ تازیانہ اُٹھایا جاتا جب وہ کوئی بیجا بات کہتا۔

اس صورتِ حال میں کیا کسی مسلمان کو جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ کسی علمی بات کا تذکرہ زبان پر لائے یا کوئی استفسار و سوال کرے۔ کیا اس طرح عقول و افکارِ مسلمانوں کے زنگ آلود نہیں بنائے گئے اور کیا یہی وہ علمی فریضہ ہے جو ایک خلیفۂ رسول کو انجام دینا چاہئیے؟

حضرت عثمان کو تو صحابہ کی عام مخالفت اور بغاوت کی وجہ سے اس طرح کے مواقع ہی حاصل نہیں ہوئے لیکن اتنا پھر بھی معلوم ہو سکا کہ آپکو

اس مسئلہ کا علم نہیں تھا کہ زوجہ کو اپنی شوہر کی وفات کے بعد اسی مکان میں رہنا چاہئے جہاں کہ اس نے چھوڑا تھا یہاں تک کہ فریعہ بنت مالک ابو سعید خدری کی بہن نے آپ کو اس مسئلہ سے آگاہ کیا۔ لہ

یہ ہے حالت اس شرط کی جو ایک "خلیفۂ دینی" کے لئے مقصود اہم اور رکن اعظم" کی حیثیت سے قرار دی گئی ہے۔ مذکورۂ بالا واقعات کی بنا پر کہنے دیجئے کہ اس پہلو سے یہ حضرات نہ صرف امیر المومنین حضرت علی سے بلکہ دوسرے بہت سے اُن صحابہ کے عقب میں تھے جو مسائل شرعیہ میں فقیہ کا درجہ رکھتے تھے اور رسالت مآب کے فیض علم سے مستفید ہوئے تھے۔

(دوسری شرط)

تدابیر جنگ سے واقفیت اور سیاسی بصیرت

اس شرط کے پہلے جزو کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا اس لئے کہ اس قسم کا سوال اُسی وقت پیدا ہو سکتا تھا جب آپ حضرات کو کبھی بہ حیثیت جنرل فوج کی تنظیم و ترتیب اور اُس کو دشمن سے صف آرا بنانے کا موقع ہوا ہوتا۔ لیکن یہ تاریخ کی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان حضرات کو کبھی کوئی ذمہ دارانہ منصب سپرد نہیں کیا اور ہمیشہ دوسروں کا ماتحت رکھا یہاں تک کہ سب سے آخر میں تو عمر اسامہ بن زید کو جو عام طور سے ایک

لہ رفع الملام عن الائمۃ الاعلام مطبوعہ مصر صـ۲۵

غلاموں کے فرزند سمجھے جاتے تھے جنگ روم کے لئے ان پر افسر مقرر کر دیا جس پر بڑی "سرکشیں" اور "سرگرانی" پیدا ہوئی بلکہ حکم رسول سے "سرتابی" نے عملی شکل اختیار کر لی اور رسول اللہ کو تاکیدی حکم دینا پڑا اور اتنے سخت الفاظ استعمال فرمانا پڑے کہ

جہزوا جیش اسامۃ لعن اللہ من تخلّف عنھا

لیکن یہ تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے کہ یہ لشکر رسول اللہ کی موجودگی میں نہ روانہ ہونا تھا نہ روانہ ہوا اور وہی لوگ جو آج بڑے درجوں پر فائز سمجھے جاتے ہیں اُن الفاظ کی زد میں آئے اور ہمیشہ کے لئے رہ گئے اس لئے کہ اس کے بعد پھر رسول کی طرف سے کسی رحمت کی دعا کا ثبوت نہیں ہے۔

رہ گیا دوسرا جزو اُس پر بڑا زور صرف کیا جا رہا ہے اور ہر پھر کے یہی ایک چیز رہ جاتی ہے جسے خلفاء کے لئے بڑے شد و مد سے ثابت کیا جاتا ہے لیکن اس سلسلہ میں نمائشی الفاظ کی روانی، تقریر کی صفائی آواز کی بلندی اور اظہار کی طاقت سب ختم ہو جاتی ہے حضرت عمر کی ذات پر مگر حضرت عثمان کی تاریخ کا ورق سامنے آیا اور طاقت گفتار نے جواب دیا آپ کا پورا دور خلافت مجموعہ ہے سیاسی غلطیوں کا جنھوں نے آخر میں آپ کی کشتی حیات کو غرق کیا اور کہنے دیجئے کہ بالکل اُسی طرح کا اجماع جیسا

ان حضرات کی خلافت پر ہوا تھا ویسا ہی بلکہ اُس سے زیادہ پُر شکوہ اجماع آپ کے قتل پر ہوا اور اسلام میں وہ شرمناک مثال قائم ہوئی جو انتہائی قابل افسوس ہے۔ حقیقتاً حضرت علی بن ابیطالب کے دور کا تمام اضطراب و انتشار نتیجہ ہے اُس حد سے گذری ہوئی صورت حال کا جو حضرت عثمان کے دور میں موجود تھی جو حضرت عمر کا مخصوص تدابیر کے ماتحت جناب عثمان تک خلافت کا پہونچانا اسے اگر اسلام کی خیر خواہی کے نقطۂ نظر سے بغیر نیت پر حملہ کئے ہوئے تعبیر کیا جائے تو وہ ایک بڑی سیاسی غلطی ہی ہوسکتی ہے جس کے نتائج بہت خراب صورت میں نمودار ہوئے۔

شام پر امیر معاویہ کا تسلط بھی جس نے "ملوکیت" کی شکل اختیار کی اسی دور میں انجام پایا اور یہ واقعہ ہے کہ "نوجوان" "پُرحوصلہ" معاویہ نے حضرت عمر کے سیاسی جبروت کو تھوڑی ہی مدت میں "مرعوبیت" کی حد تک مغلوب کر لیا تھا جس کا مظاہرہ اُس وقت ہوا جب آپ شام تشریف لے گئے اور معاویہ کی شان و شوکت کو دیکھکر آپ نے ٹوکنے کی ضرورت محسوس کی اور اُدھر سے دو فقروں میں آپ کو اس طرح قائل کر دیا گیا جس کا اقرار آپ کو خود کرنا پڑا۔

غرض یہ ہے کہ سیاسی تدبر کی حیثیت سے اگر کچھ درجہ قرار دیا بھی جاسکتا ہے تو حضرت عمر کا لیکن وہ بھی غلطیوں سے خالی نہیں ہے اور وہ غلطیاں

اتنی اہم اور غیر معمولی تھیں جن کے نتائج انتہائی خراب یتوں میں نمودار ہوئے۔

(تیسری شرط)

شجاعت و قوت اور ثبات قدم و استقلال

یہ انتہائی مایوسی کی جگہ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے دل کو رسول اللہ کی موجودگی میں اور حضرت کے ساتھ جو قوت و طاقت حاصل ہوسکتی ہے وہ رسول اللہ کے بعد کبھی حاصل نہیں ہوسکتی خصوصاً جبکہ وہ رسول خود ثبات و استقلال میں ایک ایسا نمونہ تھا جس کی مثال غیر ممکن ہے۔

پھر اگر رسول اللہ کے ساتھ کی لڑائیوں میں کمزوری کا مظاہرہ ہو اور ثبات و استقلال رخصت نظر آئے تو اس کے بعد کیا امید باقی رہ سکتی ہے

"ہر نام صاحب نے اپنے ابتدائی مضمون میں جو تمام اس بحث کا سنگ بنیاد ہی اس قسم کے واقعات پوری امانت و دیانت کے ساتھ نقل کر دئے ہیں جو ناقابل انکار حیثیت رکھتے ہیں۔ جناب جلیل الرحمٰن صاحب اعظمی بھی اپنے مضمون مندرجہ نگار میں تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت علی نوجوان تھے۔ بہادر اور شیر دل تھے اس لئے میدان کارزار ہمیشہ ان کے ہاتھ رہا، حضرت ابو بکر بوڑھے اور کمزور تھے اس لئے انھیں معرکہ ہائے جنگ میں کوئی طرہ امتیاز حاصل نہ تھا"۔

حالانکہ حضرت ابو بکر کے بڑھاپے کا جن رقت انگیز الفاظ میں تذکرہ

کیا گیا ہے وہ چنداں صحیح نہیں ہے کیونکہ آپ رسول اللہ کے بالکل ہمسن تھے اس لئے اگر آپ زمانہ خلافت میں ضعیف العمر ہے بھی ہوں تو اسلام کی لڑائیوں میں اس حد تک بوڑھے نہ تھے۔

اسلامی مجاہدین میں بہت سے افراد ان سے زیادہ کبیر السن تھے علی بن ابیطالب نے آخر عمر میں اپنی جمل اور صفین اور نہروان کی لڑائیوں میں دکھلا دیا کہ شجاعت و قوت یا ثبات قدم و استقلال کا تعلق کسی خاص عمر کے ساتھ نہیں ہے جس کے قدموں کو بھاگنے کی عادت نہ ہو وہ بڑھاپے میں بھی اسی طرح ثابت قدم رہ سکتا ہے جس طرح جوانی میں۔

پھر اگر حضرت ابوبکر بوڑھے اور کمزور تھے تو حضرت عمر اور عثمان تو اس قدر نہ تھے حالانکہ میدان جنگ کے ناگوار واقعات میں یہ بزرگواران حضرت ابوبکر سے تقدم رکھتے ہیں۔

اپنی خلافت کے زمانہ میں ان حضرات نے کبھی اس طرح کا موقع آنے ہی نہ دیا کیونکہ ہمیشہ دوسرے سپہ سالاروں کو لڑنے کے لئے بھیجا اور خود مرکز خلافت سے قدم نہیں ہٹایا۔ دو ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ حضرت عمر نے خود یا لوگوں کے کہنے سے خیال ظاہر کیا جنگ میں تشریف لے جانے کا۔ مگر اس موقع پہ کچھ سوچ سمجھ کر علی بن ابیطالب سے مشورہ کیا جن کی اصابت رائے اور سیاسی تدبر کو آج معرض بحث میں لایا جا رہا ہے اور خود اعتمادی کی اسپرٹ رکھنے والے

"اپنی رائے پر قائم رہنے والے" خلیفۂ وقت نے علی بن ابیطالبؑ کے منع کرنے سے ہی جنگ میں جانے کا خیال ترک کر دیا۔

یہ دونوں مشورے تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر کو خود اپنی شجاعت پر اور دوسرے حقیقت سے واقف افراد کو بھی کتنا اعتماد حاصل تھا۔

پہلا مشورہ غزوۂ روم کے متعلق ہے جب حضرت عمر نے خود جانے کا حضرت علیؑ سے مشورہ کیا تو آپ نے فرمایا۔

قد توکل اللہ لاھل ھذا الدین باعزاز الحوزۃ وستر العورۃ والذی نصرھم وھم قلیل لا ینتصرون ومنعھم وھم قلیل لا یمتنعون، حی لا یموت انک متی تسر الی ھذا العدو بنفسک فتلقھم فتنکب لا تکن للمسلمین کانفۃ دون اقصی بلادھم فلیس بعدک مرجع یرجعون الیہ فابعث الیھم رجلا مجربا واحفز معہ اھل البلاء والنصیحۃ فان اظھر اللہ فذلک ما تحب وان تکن الاخری کنت ردءً للناس ومثابۃ للمسلمین۔

(ترجمہ) خداوند عالم نے اس دین کے متعلق یہ ذمہ داری لی ہے کہ اس کے مرکز کی تقویت ہو اور کمزوریوں کی پردہ پوشی ہو اور اُس نے اُن کی مدد کی جب وہ کم تھے کوئی مدد کرنے والا نہ تھا۔ اور اُس نے

ان کی حفاظت کی جب وہ کم تھے خود اپنی حفاظت پر قادر نہ تھے، وہ اب بھی موجود ہے، زندہ ہے اور مرنے والا نہیں۔ اگر آپ خود دشمنوں کے مقابلہ کو گئے اور جنگ ہوئی اور آپ نے شکست کھائی تو مسلمانوں کے لئے کوئی جائے پناہ اُن دشمنوں کی سرحد کے قریب نہ ہوگی اور آپ کے شکست کھانے کے بعد کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جس کی طرف وہ رجوع کریں لہذا بہتر یہ ہوگا کہ آپ ایک تجربہ کار شخص کو روانہ کیجیے اور اُس کے ساتھ اُن اشخاص کو بھیجیے جو سختیاں جنگ کی اُٹھانے کی طاقت اور اخلاص و خیر خواہی رکھتے ہوں۔ اس صورت میں اگر خداوند عالم نے غلبہ عطا کیا تو یہی آپ کا مقصد ہے اور اگر معاملہ نوع دگر ہوا تو آپ تو یہاں موجود ہیں آپ کے پاس مسلمان واپس آئیں گے اور پناہ لیں گے۔

جناب سید العلما، دام ظلہ نے اس مشورہ پر بہت بسیط بحث کی ہے جو امامیہ مشن کے شائع کردہ رسالہ ابو الائمہ کے تعلیمات" میں موجود ہے۔

....

....

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے مشورے دے کر حضرت علی ابن ابیطالب نے اسلام کی عزت رکھ لی۔ ورنہ آج تاریخ اسلام کسی اور صورت پر مرتب ہوتی۔

(چوتھی شرط) عدالت اور اموال مسلمین کی حفاظت

اس سلسلہ میں کچھ کہنا جمہور مسلمین کے نقطۂ نظر سے بالکل بے محل ہے اس لئے کہ وہاں تمام رسول اللہ کی صورت دیکھنے والے مسلمانوں کے لئے (الصحابۃ کلھم عدول) کا کلیہ قرار دے لیا گیا ہے۔ اس لئے "تردامنی" آنکھوں کے سامنے نظر آئے تب بھی عدالت کا حصار "حرف گیری" سے مانع ہے۔

یہ ان لوگوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے کبھی راہ چلتے دم زدن کے لئے بھی بحالت اسلام رسول اللہ کی زیارت کرلی ہے پھر چہ جائیکہ "وہ صحابۂ کبار" جن کو اکثر رسول اللہ کی صحبت کا شرف حاصل رہا ہو۔ اُن میں تو اس کے خلاف شبہہ بھی کرنا کفر کے درجہ سے قریب ہے۔

مگر اس کو کیا کیا جائے کہ "آزاد بحث" اس طرح کے یک طرفہ مسلمات کی پابند نہیں ہوسکتی۔

اگر "عدالت" کو عام معنی میں لیا جائے جسے کہتے ہیں "کبائر سے اجتناب اور صغائر پر عدم اصرار" تو قرآن و حدیث اور تاریخ "فرار عن الزحف" ہی کا وہ مرقع پیش کردیگی جس کے سامنے دعوائے عدالت سربگریبان ہوجائے اور رسول اللہ کی زندگی کے بالکل آخری حصہ میں جیش اسامہ سے تخلف کا قصہ سامنے آئیگا جس کی معافی کی سند بھی ڈھونڈھے سے دستیاب نہیں ہوسکتی۔

لیکن جبکہ "عدالت" کو محدود معنی میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف اور اموال مسلمین کی منصفانہ رعایت کے ساتھ حفاظت کے اعتبار سے دیکھا جائے جو اس شرط کے اعتبار کا منشار قرار دیا گیا ہے تو

"فدک" کا معاملہ سامنے آجاتا ہے جس میں شیعہ تو شیعہ بہت سی محقق شیوہ علمائے اہلسنت بھی "انگشت بدندان" نظر آتے ہیں اور بہرحال وہ مسئلہ اب تک "عقدۂ لاینحل" بنا ہوا ہے۔

پھر حضرت عثمان کے زمانہ میں تو تقسیم اموال کی جو صورت ہوئی وہ ایسی ہے کہ تمام صحابہ فریادی نظر آنے لگے اور انجام کار یہ بھی ایک سبب ہوا اُس ہنگامہ کا جو آپ کی "شہادت" پر ختم ہوا۔ یہ واقعات تاریخ اسلام میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ اُنکا تذکرہ اس موقع پر طول کے اندیشہ سے ترک کیا جاتا ہے۔

(پانچویں شرط)

عزم کی مضبوطی اور ارادہ کی پختگی

یہ شرط جناب "م ح" صاحب کی قرار دی ہوئی ہے۔ اسے دوسرے لفظوں میں "خود اعتمادی" اور "مستقل مزاجی" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے معنی ہیں اپنی صحیح رائے پر پورا بھروسہ ہونا اور مخالف رائے سے متاثر نہ ہونا۔ یہ بحث بعد کو آئیگی کہ یہ شرط کہاں تک قابل قبول ہے۔ ابھی یہ دیکھنا ہے کہ یہ شرط حضرات خلفائے ثلثہ پر کہاں تک

منطبق ہوتی ہے۔

خطا معاف حضرت ابو بکر کی "خود اعتمادی" کی صفت یا اپنی صحیح رائے پر بھروسا ہونے کا خیال اس خطبہ سے ظاہر ہو جاتا ہے جو آپ نے سب سے پہلے تخت خلافت پر قدم رکھتے ہی ارشاد فرمایا تھا۔

ملاحظہ ہو صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص۔

تکلم ابو بکر فحمد اللہ واثنی علیہ ثم قال اما بعد ایہا الناس فانی قد ولیت علیکم ولست بخیرکم فان احسنت فاعینونی وان اسأت فقومونی۔

(ترجمہ) "حضرت ابو بکر نے تقریر کی۔ آپ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔ ایہا الناس میں تمھارا حاکم ہوا ہوں مگر میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں ٹھیک طریقہ اختیار کروں تو میری امداد کرنا اور اگر میں غلطی کروں تو میری اصلاح کر دینا۔"

دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔

اما بعد فانی قد ولیت ھذا الامر وانا لہ کارہ وواللہ لوددت ان بعضکم کفانیہ الا وانکم ان کلفتمونی ان اعمل فیکم بمثل عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم اقم کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبداً اکرمہ اللہ بالوحی وعصمہ بہ الا وانما انا بشر

ولست بخیر من احد کم فراعونی فاذا رأیتمونی استقمت فاتبعونی
واذا رأیتمونی زغت فقوّمونی ۔

"میں اس منصب پر مقرر ہوا ہوں درصورتیکہ میں اسے ناپسند کرتا تھا
اور خدا کی قسم مجھے آرزو تھی کہ کوئی تم میں سے اس بار کو مجھ سے لے لیتا
اب اگر تم مجھ سے یہ چاہو کہ میں تم میں ویسا طرز عمل اختیار کروں جو رسول اللہ
کا تھا تو میں اسے پورا نہیں کر سکونگا۔ رسول اللہ ایک مخصوص بندے تھے
جن کو خدا نے وحی کے ساتھ معزز کیا تھا اور اس طرح غلطی سے انھیں محفوظ
رکھا تھا مگر میں ایک معمولی انسان ہوں اور تم میں سے کسی ایک سے بہتر
نہیں ہوں لہٰذا تم میری نگرانی کرتے رہو اگر دیکھو کہ میں سیدھی راہ پر ہوں
تو میری پیروی کرو اور اگر دیکھو کہ میں کج ہو رہا ہوں تو مجھے سیدھا کردو"
یہ ہیں وہ الفاظ جن سے ضمیر کا غیر مطمئن اور دل کا ڈانواڈول
ہونا صاف ظاہر ہے۔

ذرا موازنہ کیجئے ان سے امیر المومنین حضرت علیؑ کے قول کا جو آپ
اپنے خطبہ میں فرماتے ہیں [1]

انتم الکم علی سنن الحق فی جواد المضلۃ حیث تلتقون ولا دلیل وتحتفرون
ولا تمیھون عزب رأی امرئ تخلف عنی ما شککت فی الحق مذ اریتہ

"کھڑا ہوں میں تمھارے واسطے حق کے راستے پر گمراہی کے چوراہی کے

[1] نہج البلاغہ جلد ا مطبوعۂ مصر صفحہ ۴۴

اندر جس جگہ تم سب بہم ہوتے ہو اور کوئی رہنما نہیں ملتا اور کوشش کرتے ہو اور کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ غلط ہے رائے اُس کی جو مجھ سے مخالفت کرے۔ شک نہیں ہوا مجھے حق میں کبھی جب سے میرے سامنے وہ پیش کیا گیا"۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایک انسان ہے جس کا ضمیر مطمئن ہے جسے اپنی حقیقت پر اعتماد ہے اور اپنی راست روی پر پورا بھروسہ۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں ۵۱

وان معی لبصیرتی مالبست علی نفسی ولا لبس علی "میرے ساتھ ہے میری حق بینی نہ کبھی میں نے اپنے تئیں مغالطہ میں مبتلا کیا اور نہ کبھی مجھے شبہ واقع ہوا"۔

بھلا وہ شخص دوسروں کی اصلاح کیا کرسکتا ہے جو خود طالب اصلاح ہو۔ امن یھدی الی الحق احق ان یتبع امن لا یھدی الا ان یھدی۔

ایک رہنمائے حقیقی کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے لئے اپنی ذات کو بطور نمونہ پیش کرتا ہے وہ کہتا ہے ۵۲

ارکزت فیکم رایۃ الایمان ووقفتکم علی حدود الحلال والحرام والبستکم العافیۃ من عدلی وفرشتکم المعروف من قولی وفعلی واریتکم کرائم الاخلاق من نفسی۔

---

۵۱ نہج البلاغہ ص ۴۸ ۔ ۵۲ نہج البلاغہ ص ۱۶۸

"میں نے تم میں ایمان کا جھنڈا گاڑ دیا اور تم کو حلال و حرام کی حدوں سے باخبر کیا اور تمھیں اپنی عدالت سے امن و امان کا لباس پہنا دیا اور اپنے قول و فعل سے حسن سلوک کا اوڑھنا بچھونا تمھارے لئے کر دیا۔ اور تمھارے سامنے اپنی ذات کی جانب سے بزرگ ترین اخلاق کا نمونہ پیش کیا"

وہ یہ کہہ کر جان نہیں چھوڑتا تاکہ مجھ پر وحی نہیں اُترتی اس لئے مجھ سے سنت رسول پر چلنے کا مطالبہ نہ کرو بلکہ اُس کا دعویٰ یہ ہوتا ہے لہ

واللہ ما اسمعہم الرسول شیئاً الا و ھا انا ذا الیوم مسمعکموہ وما اسماعکم الیوم بدون اسماعہم بالامس ولا شقت لہم الابصار ولا جعلت لہم الافئدۃ فی ذلک الاوان الا وقد اعطیتم مثلہا فی ھذا الزمان۔

"خدا کی قسم رسول اللہ نے اپنے زمانہ والوں کو جتنے تعلیمات پہونچائے تھے وہ آج میں تم تک پہونچا رہا ہوں اور تمھیں کوئی ایسی نئی بات نہیں سنائی جاتی جو اُنھیں سنائی نہ گئی ہو اور نہ اُن کے لئے آنکھیں کھولی گئیں اور دلوں میں احساس پیدا کیا گیا مگر یہ کہ آج تمھارے لئے وہی بات حاصل ہے"

وہ دوسروں سے چاہتا بھی ہے تو یہ نہیں کہ وہ اُسکی خود اصلاح

لہ نہج البلاغہ ص۱۷۱

کریں بلکہ یہ کہ وہ اپنے نفوس کی اصلاح میں اُس کے لئے آسانیاں بہم پہونچائیں [1]

ایھا الناس اعینونی علی انفسکم وایم اللّٰہ لانصفن المظلوم من ظالمہ ولاقودن الظالم بخزامتہ حتیٰ اوردہ منھل الحق وان کان کارھا۔

"میری امداد کرو خود اپنے نفسوں کے خلاف اور خدا کی قسم میں مظلوم کی ظالم سے داد ضرور دلاؤنگا اور ظالم کو اُس کی مہار پکڑ کر کھینچوں گا یہانتک کہ اُسے حق کے چشمہ پر پہونچا دوں اگرچہ وہ اُسے ناپسند کرتا ہو۔"

نظم ونسق اور ملکی انتظامات میں حضرت ابو بکر کے پختگی عزم، قوت فکر، اور مستقل مزاجی، اپنی صحیح رائے پر اعتماد اور مخالف طاقتوں سے مرعوب نہ ہونے کا اندازہ اس روایت سے کیجئے جسے شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی نے اصابہ ج ۳ ص۵۵ میں لکھا ہے اور ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ ج ۳ ص۱۰۸ میں بھی اُس کو درج کیا ہے کہ:۔

عیینہ بن حصین اور اقرع بن حابس حضرت ابو بکر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے پاس ایک شورہ زار زمین ہے جس میں نہ آب وگیاہ ہے اور نہ کوئی فائدہ ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو وہ زمین ہمیں

[1] نہج البلاغہ ج ۱ ص ۲۶۳

بطور جاگیر دیدیجئے شاید خدا اس کے ذریعہ سے ہم کو فائدہ پہونچائے۔ حضرت ابوبکر نے اُن لوگوں سے جو آپکے گرد و پیش بیٹھے تھے پوچھا کہ کیوں تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟ اُنھوں نے کہا اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آپنے اُن کے لئے نوشتہ تحریر فرما دیا۔ وہ اس کو لئے ہوئے حضرت عمر کے پاس گئے کہ وہ اس میں اپنی گواہی تحریر فرما دیں۔ آپنے اُس کو لیکر اُس میں تھوک دیا اور مٹا دیا وہ بڑے برافروختہ ہوئے اور بدزبانی کرنے لگے۔ پھر ابوبکر کے پاس جزبز ہوتے ہوئے گئے اور کہنے لگے خدا کی قسم کچھ سمجھ میں نہیں آتا خلیفہ آپ ہیں یا عمر؟ حضرت ابوبکر نے فرمایا نہیں بھئی خلیفہ اُن ہی کو سمجھو اتنی دیر میں عمر آ گئے اور بڑے غصہ میں حضرت ابوبکر کے سامنے کھڑے ہوئے اور کہنے لگے مجھے بتاؤ یہ زمین جو تم نے ان دونوں کو دیدی یہ تمھاری ملکیت تھی یا مسلمانوں کی تھی؟ اُنھوں نے کہا بلکہ مسلمانوں کی تھی۔ آپنے کہا پھر تمھیں کیا ہوگیا تھا جو تم نے اُسے ان دونوں سے مخصوص کر دیا۔ آپنے فرمایا میں نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے رائے لی تھی۔ حضرت عمر نے کہا کیا تمام مسلمانوں سے آپنے مشورہ لیا تھا اور رضامندی حاصل کی تھی؟ حضرت ابوبکر نے بڑی بے بسی سے کہا فقد کنت قلت لک انک اقوی علی ھذا الامر منی لکنک غلبتنی۔

"میں نے تو کہا تھا کہ تم میں امر خلافت کے انجام دینے کی مجھ سے زیادہ

طاقت ہے لیکن تم ہی نے مجھے مجبور کیا"۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب قدوری کی شرح "جوہرہ نیرہ" میں جو مصر میں شائع ہوئی ہے (ج ۱ ص ۱۶۴) میں اسی طرح کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ۔

مولفۃ القلوب جنھیں رسول اللہ کی زندگی میں عطایا دئے جاتے تھے وہ بعد رسول اللہ کے ابو بکر کے پاس آئے تاکہ آپ اُن کے لئے حسب معمول عطیہ کا فرمان صادر کردیں آپ نے لکھدیا۔ وہ اُس نوشتہ کو لے کر حضرت عمر کے پاس گئے کہ آپ کی تحریر بھی حاصل کریں آپ نے اُس کاغذ کو پھاڑ ڈالا اور فرمایا کہ اب ہم کو تمھاری ضرورت نہیں ہے۔ خدا نے اسلام کو غلبہ عطا کر دیا ہے اور تم سے مستغنی کر دیا۔ اب اگر تم مطیع فرمان رہے تو خیر نہیں تو تلوار سے تمھیں ٹھیک کیا جائیگا۔ وہ لوگ حضرت ابو بکر کے پاس آئے اور کہا۔ خلیفہ آپ ہیں یا عمر؟ فرمایا نہیں خلیفہ وہی ہیں انشاء اللہ اور آپ نے حضرت عمر کی رائے کو برقرار رکھا۔

اس کے بعد سے اہلسنت کے مذہب میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ ساقط ہوگیا یہاں تک کہ اگر انھیں خمس سے حصہ دیا جائے تو برائت ذمہ حاصل نہیں ہوگی۔

یہ ہے حضرت ابو بکر کی وہ بلند حوصلگی کی صفت جس کے لحاظ سے "م ح" صاحب آپ کی مدح میں اس طرح رطب اللساں ہیں کہ۔" وہ ابو بکر تھے ایک

کو عزم وثبات، ایک آسمان عظمت وجلال، انھیں اپنی اصابت رائے پر کامل اعتماد واطمینان تھا حضرت عمر جیسا دبنگ انسان اُن کو اپنی رائے سے باز رکھنے گیا لیکن ایسی ڈانٹ بتائی کہ اُن کو خاموش ہی رہنا پڑا"۔

یقیناً اس مدح کا ایک ایک حرف گذشتہ واقعہ سے بالکل ثابت ہے "یہ شان خلافت تھی"۔

حضرت عمر کے بقول "م ح" صاحبِ دبنگ" ہونے میں بیشک کوئی شبہ نہیں اور اسی کا نتیجہ تھا کہ حضرت ابوبکر کے زمانہ میں بھی خلافت درحقیقت آپ ہی کر رہے تھے جیسا کہ مذکورہ بالا واقعہ سے آپنے دیکھ لیا لیکن دو موقعوں پر آپ کے عزم واستقلال ثبات رائے اور خود اعتمادی کو شکست اُٹھانا پڑتی تھی ایک وہ جب کوئی مسئلہ ایسا پیش ہو جائے جس کا فیصلہ حکم شرع کے مطابق ہونا چاہیئے تو آپ کے قلبی تزلزل کا یہ عالم ہوتا تھا کہ ایک کسی بڑے آدمی کا کیا ذکر، ہر معمولی صحابی بلکہ ادنیٰ عورت کے کہنے سے بھی فوراً فیصلہ پلٹ دیتے تھے۔ اس کی مثالیں سابق میں پیش ہو چکی ہیں اور دوسرے وہ جب جان جوکھم کا مرحلہ سامنے آجائے جیسے فارس اور روم کی جنگ میں بذات خود جانے کا ارادہ اور حضرت علی کا اُس کے خوفناک پہلو کو دکھلانا اور بس آپ کا اس ارادہ کو ترک کر دینا۔ اس کی تفصیل بھی پہلے درج ہو چکی ہے۔

خالد بن الولید سے مالک بن نویرہ کے قتل کا قصاص لینے پر آپ کا حضرت ابو بکر کے زمانہ میں اصرار اور کسی اندیشہ سے حضرت ابو بکر کا اس پر عمل نہ کرنا، اس کا تقاضا تھا کہ جب حضرت عمر خلیفہ ہوں تو خالد بن الولید سے قصاص لے لیں لیکن ایسا نہیں ہوا، کیوں؟ صرف خالد کی ہیبت جو حضرت ابو بکر کو اس معاملہ میں حضرت عمر کے اصرار کے باوجود مانع رہی اُسی وجہ سے خود آپ اس فرض کے انجام دینے سے قاصر رہے

جب ان دونوں مہتم بالشان خلافتوں کا یہ عالم تھا تو اب میں حضرت عثمان کی خلافت کا جائزہ کیا لوں۔ بہرحال اس داستان کو بھی دیکھ لیجئے میرے قلم سے نہیں بلکہ خواجہ حسن نظامی کے دلچسپ انداز تحریر میں، اس لئے نہیں کہ میں اُن کی روایت کو تمام اہل سنت کے سامنے بطور سند پیش کرنا چاہتا ہوں بلکہ یہ واقعات تو تمام مسلمہ تاریخوں میں موجود ہیں لیکن صرف اس لئے کہ اُن ہی واقعات کو اُنھوں نے اپنے انداز میں درج کیا ہے۔

وہ اپنی کتاب "محرم نامہ" میں جو بار دہم ۱۳۴۸ھ میں دہلی میں شائع ہوئی ہے اور ممکن ہے اس کے بعد بھی چھپی ہو لیکن میرے سامنے یہی اڈیشن ہے۔ تحریر کرتے ہیں۔

"تاریخوں" اور معتبر کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ بہت نرم دل آدمی تھے۔ حدیث میں آیا ہے اھل الجنۃ بلہ جنتی بھولے

ہوتے ہیں ۔ ان میں بھی بھول پن بہت تھا۔

حضرت عمرؓ نے تاکید کر دی تھی کہ خلافت حاصل ہونے کے بعد اپنے خاندان اور قبیلہ کی رعایت نہ کرنا۔ مگر حضرت عثمان اس پر عمل نہ کر سکے اس کی پوری تفصیل محرم نامہ میں ملاحظہ کیجئے۔

اطمینان کے لئے صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مطبوعہ مصر صفحہ ۷۲ میں بھی یہی واقعات پڑھ لو۔ کیا اسی کا نام ہے عزم و استقلال، قوت نفس اور اطمینان جس کا گذشتہ واقعات میں مظاہرہ ہے۔ اگر پھر ضرورت ہوئی تو اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ اس وقت اتنے ہی پر اکتفا کی جاتی ہے۔

(چھٹی شرط)

اخلاقی فضیلت میں دنیا کا مکمل ترین انسان ہو

یہ بزمی صاحب نے اپنے سابق مضمون میں شرط لکھی ہے حالانکہ میں جانتا ہوں کہ یہ انھوں نے بالکل بلا قصد و ارادہ لکھی ہے اور ہرگز اس کا مفہوم ان کے ذہن میں نہیں تھا کیونکہ اگر دنیا کے مختلف افراد کے اخلاقی حدود کے اعتبار سے دیکھا جائے اور اخلاق کے معنی پر نظر کر لی جائے تو معلوم ہوگا کہ اخلاقی فضیلت میں دنیا کا مکمل ترین انسان سوائے معصوم کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن عصمت کی شرط کی نفی بزمی صاحب

اور اُن کے تمام ہنجیال کرنا ضروری سمجھتے ہیں پھر یہ شرط قلم سے کیونکر نکلی؟ صرف عقل عمومی" اور "حاسئہ اجتماعیہ" کی فطری تحریک سے۔ خیر جانے دیجئے "اخلاق" کا یہ مفہوم بلکہ اس کو لے لیجئے اُس بنام معنی ہیں جو "حسن معاشرت" کی مرادف صورت سے ہماری زبان میں استعمال کیا جاتا ہے لیکن کیا یہ حقیقت ہے کہ اخلاقی فضیلت میں خلفائے ثلثہ دنیا کے "مکمل ترین" نہ سہی بجائے خود "مکمل" انسان تھے؟ افسوس ہو کہ ایسا نہیں ہے۔

حضرت ابوبکر کو خود اس کا احساس تھا چنانچہ جو سب سے پہلا تاریخی خطبہ آپ نے ارشاد فرمایا جس کے بعض اقتباسات اس کے پہلے آچکے ہیں اُس میں آپ نے فرمایا:- واعلموا ان لی شیطانا یعترینی فاذا رأیتمونی غضبت فاجتنبونی "تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھ پر شیطان کا غلبہ ہوا کرتا ہے۔ اس لئے جب تم دیکھو کہ مجھے غصہ آیا ہے تو مجھ سے بچا کرو"[1] یہ حقیقت ہو کہ قدیم عادتیں مشکل سے چھوٹتی ہیں۔ جاہلیت کے لوگوں کی زبان پر گالیاں اکثر آتی تھیں اسلام نے اس عادت کی بہت اصلاح کی مگر وہ پھر بھی باقی رہی۔

مؤرخ ابن عساکر دمشقی نے لکھا ہے:- استب عقیل بن ابیطالب وابوبکر قال وکان ابوبکر سبابا اونسابا "عقیل بن ابوطالب اور ابوبکر میں گالم گلوج ہوئی اور ابوبکر بڑے گالیاں جاننے والے تھے یا

[1] صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص

نسب سے بہت واقف تھے"۔ ۵۱

سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ "نسابا" کی لفظ بھی ہو جب بھی اس کا مطلب یہی ہے کہ گالیوں کے لئے ماں بہن کے بکھان خوب کرتے تھے۔

اور حضرت عمر کی تو سخت مزاجی اور درشت خوئی شہرۂ آفاق ہے جس کا مظاہرہ رسول اللہ تک کے ساتھ ہوتا تھا۔ چنانچہ جب رسول اللہ عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھانے کھڑے ہوئے تو تاریخ میں ہے کہ جذبہ عمر قال الیس قد نھی اللہ ان تصلی علی المنافقین "حضرت عمر نے پکڑ کر کھینچا اور کہا کیا خدا نے آپ کو ممانعت نہیں کی ہے منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے سے ۵۲

آپ کی اس درشت خوئی کا اتنا شہرہ تھا کہ ہر شخص واقف تھا اور آپ سے ڈرتا تھا۔ چنانچہ جب آپ نے ام کلثوم دختر ابوبکر کے ساتھ شادی کی درخواست حضرت عائشہ سے کی اور ام المومنین نے مصلحتاً آپ سے اس کا وعدہ کیا اور آپ اٹھ کر تشریف لے گئے تو لڑکی نے اپنی بڑی بہن سے کہا تزوجینی وقد عرفت غیرتہ وخشونتہ عیشہ واللہ لئن فعلت لاخرجن الی قبر رسول اللہ ولاصیحن بہ۔

آپ میری شادی ان کے ساتھ کر دیں گی حالانکہ آپ کو اُن کا غصہ

---

۵۱ صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۷۴ ۵۲ استیعاب مطبوعہ حیدرآباد ج ا ص ۳۷۵

اور طرز معاشرت کی درشتی معلوم ہے۔ بخدا اگر آپ نے ایسا کیا تو میں رسول اللہ کی قبر پہ جا کر فریاد کرونگی ۔ [۱]

سقیفہ میں جو آپ کی جانب سے اخلاقی نمونہ پیش ہوا وہ اس کے پہلے آچکا ہے۔ دوسرے موقعوں پر جو بات بات پر آپ کا کوڑا اُٹھ جاتا تھا اُس کی بعض مثالیں پہلے آچکی ہیں۔ کوئی آپ کی تعظیم کے لئے نہ کھڑا ہوا کوڑا مار دیا [۲]

کسی نے قرآن کے کسی متشابہ آیت کے معنی دریافت کئے آپ نے کوڑے لگائے اتنے کہ وہ زخمی ہو گیا اور اُس کے سر سے خون جاری ہو گیا [۳]

کسی نے قرآن کی کسی آیت کے بارہ میں کچھ معلومات کا اظہار کرنا چاہا آپ نے کوڑا لگا دیا [۴]

اس کا ایک نمونہ اور ملاحظہ کر لیجئے۔ قبیصہ بن جابر اسدی کی روایت ہے کہ میں احرام باندھے ہوئے تھا۔ میں نے ایک ہرن دیکھا اُس کے تیر لگا دیا۔ وہ مر گیا اس سے مجھے شک پیدا ہوا۔ میں حضرت عمر کے پاس آیا آپ کے پہلو میں عبدالرحمٰن بن عوف تھے۔ میں نے حضرت عمر سے مسئلہ دریافت کیا۔ آپ نے عبدالرحمٰن کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا "کیوں تمھارے

---

[۱] استیعاب مطبوعہ حیدرآباد جلد ۲ صفحہ ۷۳۶ [۲] صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۔
[۳] اتقان سیوطی مطبوعہ دہلی صفحہ ۲۸۶ ۔ [۴] اتقان مطبوعہ دہلی صفحہ ۲۴۴

نزدیک ایک بکری کی قربانی اس کے لئے کافی ہو گی" اُنھوں نے کہا "ہاں کافی ہے" تب حضرت عمر نے مجھے حکم دیا کہ ایک بکری ذبح کروں جب ہم لوگ وہاں سے اُٹھے تو میرے ایک ساتھی نے مجھ سے کہا کہ امیرالمؤمنین لم یحسن ان یفتیک حتی سئل الرجل "خلیفہ صاحب خود فتویٰ نہیں دے سکے جب تک اُس شخص سے پوچھ نہیں لیا" حضرت عمر نے کلام اُس کا کچھ سُن لیا فوراً کوڑا لے کر بڑھے اور اُسے کوڑا مار دیا۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئے کہ مجھے ماریں۔ میں نے کہا حضور میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ کہا اُس نے تھا۔ تب آپ نے مجھ کو چھوڑ دیا[1]

اس آپ کی مزاجی خصلت کا علمائے اہل سنت کو اقرار ہے چنانچہ اسمعیل بن حماد بن ابو حنیفہ کی روایت ہے کہ ہمارے یہاں ایک آٹا پیسنے والا رافضی تھا جس کے پاس دو خچر تھے ایک کا نام اُس نے رکھا تھا ابوبکر دوسرے کا عمر۔ ایک نے اُن میں سے اُس کو لات ماری جس سے وہ مر گیا۔ میرے دادا امام ابو حنیفہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا دیکھو جس نے لات ماری ہے وہ وہی ہو گا جس کا نام "عمر" ہے۔ لوگوں نے دیکھا تو واقعہ یہی تھا[2]

رہ گئے جناب عثمان اُن کے بہت سے واقعات آپ کے سامنے آ چکے ہیں

[1] حیوٰۃ الحیوان ج ۲ ص ۸۶۔ [2] حیوٰۃ الحیوان ج ۱ ص ۲۴۴۔

جن میں آپ کو اخلاقی جوہر بھی دکھلائی دینگے۔

حضرت ابو ذر غفاری جن کے متعلق رسول اللہ کا ارشاد تھا ما اظلّت الخضرآء ولا اقلت الغبرآء علی اصدق من ابی ذر" نہ آسمان نے سایہ ڈالا اور نہ زمین نے اُٹھایا کسی ایسے شخص کو جو ابو ذر سے زیادہ سچا ہو"۔

حضرت عمار یاسر جن کے لئے رسول اللہ کا ارشاد تھا عمار جلدۃ ما بین عینی "عمار میری آنکھوں کے درمیان کی کھال ہے"۔

حضرت عبداللہ بن مسعود جن کے لئے رسول اللہ کا ارشاد تھا من اراد ان یقرأ القران غضا فلیقرأہ علی قراءۃ ابن ام عبد" جو شخص قرآن کو ترو تازہ پڑھنا چاہتا ہو وہ ابن مسعود کی قرأت پر پڑھے"۔ ان تمام محترم صحابیوں کے ساتھ ضرب شدید کا ارتکاب کس نے کیا؟ مسلمانوں کے نمائندوں کو محل کے دروازے پر سے دھکے دیکر کس نے نکلوا دیا؟ حضرت علی کے درمیان میں پڑنے پر مروان کی علحدگی کے وعدے کر کے پھر اُن وعدوں کی مخالفت کس نے کی؟

اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں۔

کیا ایسے ہی اشخاص کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ" وہ اخلاقی فضیلت میں دنیا کے مکمل ترین انسان تھے"۔ معلوم ہوا کہ شرائط خلافت میں سے کوئی ایک شرط بھی ایسی نہ تھی جو ان حضرات میں موجود سمجھی جا سکے پھر آخر

آخر ان کی حکومت کو "خلافت رسول" کس طرح سمجھا جائے اور اُن کی امامت کو کیونکر صحیح و حق بجانب قرار دیا جائے۔

بیشک اگر صرف بادشاہت کا سوال ہے تو اس میں کیا شبہہ کہ یہ لوگ حکمران تھے پھر یہ جھگڑے کی کون سی بات ہے۔ اور اس میں اختلاف کی کیا گنجائش ہے۔

حضرت علی ابن ابیطالب پر شرائط خلافت کا انطباق

اب آئیے دیکھیں گذشتہ شرائط کے لحاظ سے حضرت علی بن ابیطالب کا کیا درجہ نظر آتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ پہلی، تیسری، چوتھی اور چھٹی شرط کے لحاظ سے آپ کی بلندی اتنی واضح ہے کہ کسی کو اُس میں گنجائش کلام ملتی ہی نہیں۔

علی کا علم علی کی شجاعت علی کی عدالت اور علی کی اخلاقی فضیلت اتنی روشن حقیقتیں ہیں کہ اُن کے متعلق کچھ لکھنا بھی بیکار ہے۔

بہت کاوش و کاہش کے ساتھ اگر گنجائش بحث نکالی جاتی ہے تو وہ صرف دو باتوں میں۔ ایک سیاسی قابلیت اور دوسرے عزم و ارادہ کی پختگی "م ح" صاحب نے جانفشانی اور عرقریزی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جناب امیر میں یہ دونوں صفتیں مفقود تھیں۔" وہ کہتے ہیں کہ "اُن کو دوسروں سے اختلاف رائے کی ہمت کم ہوتی تھی۔ وہ اپنے عزائم میں غیر معمولی طریقہ سے ثبات و استقلال نہیں رکھتے تھے۔ اُن کو خود اپنی صحیح رائے پر پورا بھروسا نہ ہوتا۔ وہ مخالف طاقتوں سے مرعوب ہو جاتے۔ اُن میں وہ قاہرانہ

سطوت اور آمرانہ دبدبہ نہیں تھا جس کی وجہ سے لوگ اُن کی باتیں مان لیتے یا اُن کے احکام پر عمل پیرا ہوتے۔"

میں اس نکتہ رسی پر "م ح" صاحب کو قابل الزام نہیں سمجھتا کیونکہ حضرت علی بن ابیطالب کی حکومت کا دور جن متواتر مثالوں کے بعد آیا اُن کے تناسب سے جب حضرت علی کے طرز حکومت کو دیکھا جائیگا تو وہ بالکل مختلف ضرور نظر آئیگا اور اسی لئے اس موقع پر آپ خلافت کے قبول کرنے سے انکار بھی فرما رہے تھے اور کہتے تھے دعونی والتمسوا غیری "مجھ کو معاف کرو کسی اور سے کہو"

اور اسی لئے حضرت عثمان کی خلافت پر آپنے صاف انکار کر دیا کہ سنت شیخین کی پابندی میں نہیں کر سکتا" اس کی تفصیل بعد کو آئیگی۔

مجھے حضرت علی کی خلافت کے سمجھانے کے لئے ضرورت پڑتی ہے کہ پچیس برس پہلے کی تاریخ الٹ کر حضرت رسول اللہ کی طرز حکومت کو دیکھوں مجھے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نقش ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ اور آپس میں اختلاف نہیں ہے۔

"م ح" صاحب کے نقطۂ نظر کی عینک لگا کر جب میں دیکھتا ہوں تو مجھے وہاں بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے اختلاف رائے کی بنا پر وہ اپنی رائے پر قائم نہیں رہے جس کا نتیجہ اُن کے حق میں خراب بھی نکلا۔

چنانچہ جنگ احد میں حضرت رسول کی خود رائے یہ تھی کہ مدینہ ہی میں قیام فرمائیں۔ اور وہیں رہ کر دشمنوں سے جنگ کریں مگر بہت سے مسلمانوں نے یہ کہا کہ نہیں اس میں کفار سمجھیں گے کہ ہم ڈر گئے اور ہم نے بزدلی سے کام لیا۔ یہ سن کر حضرت بیت الشرف میں تشریف لے گئے اور آپ لباس حرب سے آراستہ ہو کر باہر تشریف لائے جب ان لوگوں نے دیکھا کہ حضرت آمادہ ہو گئے تو یہ لوگ پشیمان ہوئے اور آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ کتنا برا کیا تم لوگوں نے رسول اللہ کو ان کی رائے کے خلاف مشورہ دیا۔ حالانکہ اُن پر وحی اُترتی ہے۔ آخر رسول اللہ سے کہا کہ جو آپ کو مناسب معلوم ہو وہ کیجئے۔ اور معذرت کی

آپ نے فرمایا نہیں اب جب میں تیار ہو گیا تو جاؤں گا ضرور۔ [۱]

نتیجہ وہی ہوا جس کی آپ نے پہلے سے خبر دی تھی کہ سخت شکست اور تباہی سے دوچار ہونا پڑا صرف رسول اللہ کا اپنے طرز عمل کو لوگوں کی مخالفت کی بناء پر بدلنا کیسا بلکہ ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ احکام خدا میں تبدیلی ہو گئی لوگوں کی عملی مخالفت کی وجہ سے جیسے ابتدائے اسلام کا یہ حکم کہ زمانہ ماہ صیام میں رات کے وقت بھی عورتوں کے ساتھ مخصوص تعلقات جائز نہیں ہیں جناب عمر بن الخطاب اور مالک ابن ابی انس یا کعب بن مالک نے اس حکم کی مخالفت کی آخر وہ حکم منسوخ ہو گیا اور رات کو یہ امر جائز ہو گیا۔ [۲]

---

[۱] حیٰوۃ الحیوان جلد ۲ صفحہ ۴۲-۴۳ [۲] استیعاب ج ا مطبوعہ حیدرآباد صفحہ ۳۳۳ نعمات القرآن فی عجائب القرآن للحافظ السیوطی مطبوعہ مصر صفحہ ۶

یا رسول اللہ کے ساتھ نجوی کے لئے صدقہ پیش کرنے کا حکم اور اُس کی مخالفت پر اس آیت کا اترنا (االشفقتم ان تقدموا بین یدی نجویکم صدقات) تم لوگ ڈر گئے اتنے سے کہ رسول کے ساتھ باتیں کرنے کے لئے کچھ صدقہ پہلے دیدو"[1] آخر یہ حکم منسوخ کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت رسول کی رعایا آپ کا کہنا ہمیشہ نہیں مانتی تھی۔

ولو انا کتبنا علیہم ان اقتلوا انفسکم او اخرجوا من دیارکم ما فعلوہ الا قلیلا منھم" اگر ہم ان کو حکم دیں کہ تم اپنے خاص اشخاص کو قتل کرو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو بہت کم وہ لوگ ہونگے جو ایسا کریں"[2] ان میں سے بہت لوگ وہ تھے جو جہاد کے حکم پر دہشت زدہ ہو جاتے تھے اور حیلہ حوالہ کرنے لگتے تھے فلما کتب علیہم القتال اذا فریق منھم یخشون الناس کخشیۃ اللہ او اشد خشیۃ وقالوا ربنا لم کتبت علینا القتال" "جب اُن پر جہاد کا فرض عائد کیا گیا تو ایک جماعت اُن میں سے لوگوں سے اس طرح ڈرنے لگی جیسے خدا سے ڈرا جاتا ہے یا اس سے بھی زیادہ اور کہنے لگے پروردگارا تو نے ہم پر جہاد کیوں واجب کیا"[3] یہ لوگ رسول کے رعب و دبدبہ سے اتنے کم متاثر تھے کہ وہ رسول سے

---

[1] سورہ مجادلہ پ ۲۸ ۔ [2] سورہ نساء پ ۵

[3] نساء پ ۵

لڑتے اور جھگڑا کرتے تھے کما اخرجک ربک من بیتک بالحق و ان

فریقا من المؤمنین لکارھون یجادلونک فی الحق بعد ما تبین

کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون ۔

"جیسے تم کو تمھارے رب نے سچائی کے ساتھ اپنے مکان سے نکلنے کا

حکم دیا اس حالت میں کہ ایک جماعت مسلمانوں کی اس کو ناپسند کرتی تھی

یہ لوگ تم سے لڑتے تھے حق کے معاملہ میں جبکہ وہ ظاہر ہو چکا تھا معلوم ہوتا

تھا کہ یہ موت کی طرف لے جائے جا رہے ہیں درانحالیکہ وہ دیکھ رہے

ہیں۔" [1]

رسول اللہ جہاد کا حکم دے رہے ہیں اور لوگ سرگرانی سے کام لے

رہے ہیں مالکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل اللہ اثاقلتم الی الارض

"آخر یہ کیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں جنگ کے لئے

نکلو تو تم گرانجانی کے ساتھ زمین گیر ہو جاتے ہو" [2]

ان لوگوں میں وہ لوگ بھی تھے جو رسول کو ایذا پہونچاتے تھے منھم

الذین یؤذون النبی و یقولون ھو اذن ۔

"ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو رسول کو اذیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں

کہ وہ تو بس کان ہیں یعنی جو[3] وہ رسول اللہ

[1] انفال پ ۹ [2] توبہ پ ۱۰

کا اور اُن کی باتوں کا مذاق تک اڑاتے تھے، ولئن سئلتھم لیقولن انما کنا نخوض ونلعب قل اباللہ وایاتہ ورسولہ کنتم تستھزءون۔

"اگر ان سے پوچھو تو کہیں گے کہ ہم تو باتیں کر رہے تھے اور ہنس کھیل رہے تھے کہو کہ کیا تم خدا اور اُس کی آیتوں اور اُس کے رسول کا مذاق اُڑا رہے تھے" سلہ

اطاعت و فرمانبرداری تو بعد کی چیز ہے اور وقعت دینا دوسرا مرحلہ ہے یہ لوگ آپ کی باتوں کو غور سے سننے تک نہ تھے۔ (ومنھم من یستمع الیک حتی اذا خرجوا من عندک قالوا للذین اوتوا العلم ماذا قال انفا)

"ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تمھاری باتوں کو ظاہر میں سننے آتے ہیں اور جب تمھارے پاس سے جاتے ہیں تو دوسرے لوگوں سے جو واقفیت رکھتے ہیں پوچھتے ہیں، یہ ابھی انھوں نے کیا کہا تھا" سلہ

یہ لوگ رسول اللہ کی محفل میں بیٹھ کر داب مجلس تک کا لحاظ نہ کرتے تھے اور آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے تھے۔ ان کو منع بھی کیا گیا جب بھی کوئی سماعت نہیں کی۔

الم تر الی الذین نھوا عن النجوی ثم یعودون لما نھوا عنہ ویتناجون بالاثم والعدوان ومعصیت الرسول "کیا تم نے نہیں دیکھا

سلہ توبہ پ ۱ سلہ سورۂ محمد پ ۲۶ ۔

ان لوگوں کو جنھیں سرگوشیوں سے ممانعت ہوئی تھی پھر بھی اُنھوں نے وہی کیا جس سے منع کیا گیا اور گناہ وظلم اور رسول کے حکم کی مخالفت کے ساتھ یہ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔

ان لوگوں کے دل پر خود رسول کی عظمت کا اتنا کم اثر تھا کہ مسجد میں آپ کی موجودگی میں، اور آپ کے خطبہ پڑھنے کی حالت میں باجے کی آواز سُن کر یہ دیکھنے چلے جاتے تھے اور رسول اللہ کو کھڑے کا کھڑا چھوڑ دیتے تھے۔

واذا رأوا تجارۃ او لھوا انفضوا الیھا وترکوک قائما۔

جب اُنھوں نے تجارت دیکھی یا لہو ولعب دیکھا متفرق ہوگئے اُس کے لئے اور تم کو کھڑا ہوا چھوڑ دیا۔[۱]

وہ لوگ سب مخالفتیں کرتے تھے۔ رسول کو تکلیفیں دیتے تھے آپ کی رد کرتے تھے۔ اور بے اعتنائی سے کام لیتے تھے مگر رسول اللہ کی جانب سے نہ اُن کے خلاف تلوار اُٹھائی جاتی تھی نہ کوڑا بلند کیا جاتا تھا بلکہ بے بس اور کمزور لوگوں کی طرح اُنھیں عذاب خدا سے ڈرانے پر اکتفا کی جاتی تھی اور خدا کی قوت کا حوالہ دیا جاتا تھا فان زللتم من بعد ماجاءتکم البینات فاعلموا ان اللہ عزیز حکیم۔ اگر تم لوگ ٹھوکر کھاؤ بعد اس کے روشن دلیلیں تمھارے سامنے آچکیں تو سمجھ لو کہ خدا غالب وقاہر اور بڑا مصلحت بیں ہے۔[۲]

۱۔ جمعہ پارہ ۲۸ ۲۔ بقرہ پارہ ۲

الا تنفروا یعذبکم عذابا الیما "اگر تم جہاد کو نہ گئے تو خدا تمھیں دردناک عذاب کریگا" لے

والذین یؤذون رسول اللہ لهم عذاب الیم "جو لوگ رسول کو ایذا پہونچاتے ہیں اُن کے لئے دردناک عذاب ہے" کے

فان یتوبوا یک خیرا لهم وان یتولوا یعذبهم اللہ عذابا فی الدنیا والاخرة "اگر اُنھوں نے توبہ کر لی تو ان کے لئے بہتر ہے اور اگر انھوں نے روگردانی کی تو خدا اُن پہ عذاب نازل کریگا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی" سے

ان الذین یوذون اللہ ورسولہ لعنهم اللہ فی الدنیا والاخرة واعد لهم عذابا مهینا "یہ لوگ جو خدا و رسول کو ایذا پہونچاتے ہیں۔ دنیا و آخرت میں اُن پہ لعنت ہے اور خدا نے اپنی حقارت آمیز عذاب کو ان کے لئے مہیا کر رکھا ہے" کے

ان کے لئے رسول اللہ کی جانب سے اعلان کر دیا گیا تھا کہ رسول کا کام تمھیں صرف ہدایت کر دینا ہے اور بس۔ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول فان تولیتم فانما علی رسولنا البلاغ المبین۔

"خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی۔ اگر تم نے روگردانی کی تو ہمارے رسول کا فرض صرف واضح تبلیغ کر دینا ہے" ھے

لے توبہ پ۱۰ ۲ے توبہ پ۱۰ ۳ے توبہ پ۱۰ ۴ے احزاب پ۲۲ ۵ے تغابن پ۲۸

خداوند عالم کی جانب سے خود رسول اللہ کو مطلع کر دیا گیا کہ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ومن تولی فما ارسلناک علیھم حفیظا " جو شخص رسول کا کہنا مانے اُس نے خدا کا کہنا مانا اور جو شخص روگردانی کرے تو ہم نے تم کو اُن کا ذمہ دار قرار دے کر نہیں بھیجا ہے۔ [1]

ما علی الرسول الا البلاغ واللہ یعلم ما تبدون وما تکتمون " رسول کا کام صرف تبلیغ کر دینا ہے اور خدا جانتا ہے تمہاری سب باتوں کو جنھیں تم ظاہر کرتے ہو اور جنھیں تم مخفی کرتے ہو۔ [2]

فان تولوا فانما علیک البلاغ المبین " اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو تمہارا فرض صرف واضح طور پر تبلیغ کر دینا ہے" [3]

بالکل اس طرح جیسے حضرت علی اپنی رعیت کے لئے بددعا کرتے تھے۔

" قاتلکم اللہ لقد ملأتم قلبی قیحا وشحنتم صدری غیظا۔

" اللہ تم لوگوں کو ہلاک کرے تم نے میرے دل کو پیپ سے بھر دیا اور میرے سینہ کو غصہ سے "

اسی طرح رسول کو اپنی رعیت کے لوگوں کی کارروائیوں پر بددعا ہی کرتے بنتی تھی " قاتلھم اللہ انی یؤفکون " اللہ ان لوگوں کو ہلاک کرے یہ کیسے بھٹکتے پھرتے ہیں۔ [4]

---

[1] نساء پ ۵ [2] مائدہ پ ۷ [3] نحل پ ۱۴ [4] منافقون پ ۲۸۔

کیا یہ بادشاہان دنیا کی شان ہوتی ہے۔ کیا اسی طرح رعب و سطوت و دبدبہ قائم ہوتا ہے۔ کہاں وہ شان جبروت و جلال کہ کوئی تعظیم کے لئے کھڑا نہ ہوا تو کوڑا مار دیا گیا۔ اور کہاں یہ کہ رسول اللہ کو صرف ان کا نام لے کر لوگ پکارتے ہیں اور وہاں سے صرف زبانی ہدایت پر اکتفار کردی جاتی ہے کہ لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا۔ "رسول اللہ کے پکارنے کو اپنے اندر اس طرح نہ بنالو جیسے آپس میں ایک دوسرے کو آواز دیتے ہو[1]

رسول اللہ سے لوگ چیخ چیخ کر بات کرتے تھے اس پر بھی اخلاقی حیثیت سے تعلیم دیجاتی ہے اور خلاف ورزی کی صورت میں پھر وہی عذاب آخرت کا خوف۔

یا ایہا الذین اٰمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجھروا لہ بالقول کجھر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون

"اے مسلمانوں رسول کی آواز پر تم اپنی آواز نہ بلند کرو اور ان سے بلند آواز سے باتیں نہ کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہو اس صورت میں تمہارے اعمال حبط ہو جائینگے اور تمہیں خبر نہ ہوگی"[2]

کیا شاہان دنیا کا یہی انداز ہوتا ہے؟

---

[1] نور پ ۱۸ [2] حجرات پ ۲۶

رسول اللہ خود یہ نہیں چاہتے تھے کہ آپ کو دنیا کے بادشاہوں کی صورت پر سمجھ لیا جائے۔ جب ایک شخص رسول اللہ کے سامنے آیا اور رعب سے کانپنے لگا تو آپ نے فرمایا۔

هوّن عليك فاني لست بملك انما انا ابن امرأة من قريش كانت تاكل القديد " ٹھہر جا ٹھہر جا میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں میں تو قریش کی ایک عورت کا فرزند ہوں جو معمولی کھانا کھاتی تھی "[۱]

ان اعلانات کے بعد کہ " ان توليتم فانما على رسولنا البلاغ المبين۔ فان تولوا فانما عليك البلاغ المبين " لوگ کیا سمجھتے کہ اگر ہم ان کا کہنا نہ مانیں گے تو یہ کچھ بنا سکیں گے۔

پھر جب رسول اللہ کا یہ عالم ہے تو خلیفۂ رسول کو اس سے زیادہ کیا قدرت حاصل ہو سکتی ہے۔ مذکورہ واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ کا فرض ہے تبلیغ اور نفاذ احکام۔ اور مسلمانوں کے لئے آپ کی اطاعت اور آپ کے احکام کا بجالانا ایک مذہبی فرض کی حیثیت رکھتا ہے جس کی مخالفت میں سزائے اخروی ہے۔ دنیاوی سزا اُن ہی احکام الٰہی کی مخالفت میں ہے کہ جس میں شریعت کی جانب سے حدود و تعزیرات مقرر ہو گئے ہیں۔ اُن کی مخالفت میں بحیثیت حاکم شرع کے رسول اور

[۱] طبقات ابن سعد جلد اول قسم اول مطبوعہ لیڈن ص۷

امام حدود و تعزیرات قائم کرتا ہے جس میں اس کی جانب سے کمزوری نہیں ہونا چاہیے۔ حضرت علی نے خلیفۂ رسول اور عام امت کے اس پوزیشن کو صاف الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے۔[1]

ایھا الناس ان لی علیکم حقا و لکم علیّ حق فاما حقکم علیّ فالنصیحۃ لکم و توفیر فیئکم علیکم و تعلیمکم کیلا تجھلوا و تأدیبکم کیما تعلموا واما حقی علیکم فالوفاء بالبیعۃ و النصیحۃ فی المشھد والمغیب والاجابۃ حین ادعوکم والطاعۃ حین اٰمرکم۔

"ایہا الناس! میرا تمہارے اوپر ایک حق ہے اور تمہارا میرے اوپر ایک حق ہے تمہارا حق میرے اوپر تو یہ ہے کہ میں تمہاری خلوص دل کے ساتھ ہدایت کروں تمہارے حقوق جو زکوۃ و خمس وغیرہ میں ہیں انھیں تم میں تقسیم کروں اور تمھیں تعلیم دوں کہ تم جاہل نہ رہو اور تمھیں آداب و قواعد سکھلاؤں تاکہ تم عمل کرو۔ اور میرا حق تم پر یہ ہے کہ تم بیعت کے ساتھ وفاکرو اور سامنے اور پس پشت ہر حال میں خیر خواہی کرو اور جب تمھیں جہاد کے لئے دعوت دوں تو تم لبیک کہو اور جب حکم دوں تو تم اطاعت کرو"۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں[2]

---

[1] نہج البلاغہ مطبوعہ مصر صفحہ ۹۲-۹۳ [2] نہج البلاغہ مطبوعہ مصر صفحہ ۲۱۹

انه لیس علی الامام الا ما حمل من امر ربه الا بلاغ فی الموعظة والاجتهاد فی النصیحة والاحیاء للسنة واقامة الحدود علی مستحقیها واصدار السهمان علی اهلها۔ " امام کا فرض نہیں ہے مگر وہی جس کا وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ذمہ دار بنایا گیا ہے بس موعظہ ونصیحت کے ذریعہ سے تبلیغ کرنا اور خالص خیر طلبی میں جدوجہد کرنا اور احکام شریعت کو زندہ رکھنا اور حدود کا جاری کرنا اُن لوگوں پر جو مستحق ہوں اور زکوٰۃ وخمس کے حصوں کو پہونچانا اُن کے اہل تک۔"

یہ ہے وہ حکومت جو خلافت رسول اللہ کی حیثیت سے حاصل ہوتی ہے۔

دنیا کے ظاہر بیں لوگ جو خلافت رسول کی کامیابی فتوحات کی کثرت کے ساتھ وابستہ سمجھتے ہیں حضرت علی کی خلافت کی کیا قدر کر سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اپنے مختصر دور خلافت میں دنیا کو دکھلا دیا کہ " سیاست رسالت" کیا چیز ہے اور " خلافت نبوی" کے معنی کیا ہیں۔

بہر صورت ایک رائے پر قائم رہنا ہر گز صحیح عزم وارادہ کی پختگی نہیں ہے کیونکہ کبھی لوگوں کی مخالفت کی صورت میں حکمت ودانشمندی کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اپنی ذاتی رائے پر عمل نہ کیا جائے۔ اس صورت میں اپنی رائے پر عمل کرنا بیجا ضدی اور ہٹ دھرم کہلائیگا۔

ہر گز ہر گز عزم وارادہ کی صفت کے ساتھ قابل تعریف نہ ہوگا جیسے حضرت عثمان کا تمام مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود مروان بن الحکم کے سر چڑھائے رکھنے پر اصرار نہ سیاسی تدبر کا نتیجہ ہے نہ حکمت مصلحت بینی کا تقاضا۔

لیکن جو شخص تدبر وحکمت کے ساتھ عزم وارادہ کی صفت کا بھی مالک ہوتا ہے وہ جب مصلحت اس میں دیکھتا ہے کہ مخالفت کے ساتھ رائے میں تبدیلی کر دے اُس وقت ایسا کرتا ہے اور جب اس کے خلاف مناسب سمجھتا ہے تو مخالفت کے باوجود اپنی رائے پر قائم رہتا ہے۔

رسول اللہ کی سیرت میں ہم کو دونوں طرح کے نمونے نظر آتے ہیں اسی طرح حضرت علی بن ابیطالب ایک وقت آپ دوسرے لوگوں کی رائے پر عمل کر لیتے ہیں یہ بتا دینے کے بعد کہ وہ غلط ہے اس لئے کہ اس کے خلاف کرنے میں اپنی ہی رعیت کے اندر خونریزی کی صورت میں پیش آئیگی جسے آپ موجودہ حالت میں تباہ کن سمجھتے ہیں۔

اور دوسرے مواقع پر لوگ مخالفت کرتے ہیں لیکن آپ اپنی رائے پر سختی سے قائم رہتے ہیں۔ اس کی نظریں بہت ہیں۔ طلحہ وزبیر بغاوت کرتے ہیں اور لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ آپ اُن کا مقابلہ نہ

لیجئے اور آپ فرماتے ہیں ؎۱

واللّٰہ لا اکون کالضبع تنام علی طول اللدم حتی یصل الیہا طالبہا ویختلہا راصدہا ولکنی اضرب بالمقبل الی الحق المدبر عنہ وبالسامع المطیع العاصی المریب ابد احتی یأتی علی یومی۔

"خدا کی قسم میں اُس طرح نہیں ہو سکتا جیسے بجّو، جتنا اُس کو کھٹکھٹایا جائے وہ سوتا جاتا ہے یہاں تک کہ شکار کرنے والا پہونچ جائے اور اُس پر حملہ کر دے۔ لیکن میں اُن لوگوں کو لیکر جو حق کی طرف متوجہ ہوں اور اطاعت گذار ہوں جنگ کرونگا اُن سے جو حق سے روگرداں ہیں اور نافرمان ہیں ہمیشہ یہاں تک کہ میری عمر کا آخری دن آئے"۔

حضرت عثمان نے جو جاگیریں لوگوں کو دے دی تھیں۔ آپ نے سب واپس لے لیں لوگوں نے اس پر اعتراض کیا آپ نے فرمایا ؎۲

واللّٰہ لو وجدتہ قد تزوج بہ النساء وملک بہ الاماء لرددتہ فان فی العدل سعۃ ومن ضاق علیہ العدل فالجور علیہ اضیق۔

"خدا کی قسم اگر میں دیکھتا کہ اس مال سے عورتوں کے ساتھ شادی کی گئی ہے اور کنیزوں کی ملکیت حاصل ہوئی ہے تو بھی میں واپس کر دیتا اور جس شخص پر عدالت کا دائرہ تنگ ہو اُس پر ظلم وجور تو اور تنگی کا باعث ہوگا"۔

؎۱ نہج البلاغہ مطبوعہ مصر صـ۴ ؎۲ نہج البلاغہ صـ۲۶

جریر بن عبد اللہ بجلی آپ کی جانب سے شام بھیجے جاتے ہیں اور لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ آپ جنگ کے لئے آمادہ ہو جائیے اور آپ اختلاف فرماتے ہیں سلہ

جنگ صفین میں لوگوں کا اصرار ہے کہ جنگ شروع کیجئے اور اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں اور آپ جب تک مناسب نہیں سمجھتے اجازت جہاد نہیں دیتے ۲ہ

اطمینان قلب کا یہ عالم کہ لڑائیوں میں بغیر زرہ وغیرہ کے دشمن کی فوج پر حملہ کرتے ہیں اور لوگوں کے منع کرنے سے باز نہیں رہتے ۳ہ

تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے کہ آپ کے مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد سب اس بات کے مخالف تھے کہ معاویہ کو حکومت شام سے معزول کیا جائے لیکن آپ نے کسی کے مشورہ پر عمل نہ کیا اس لئے کہ آپ ایک ظالم شخص کے افعال کی ذمہ داری تھوڑے دن کے لئے بھی خود نہیں لینا چاہتے تھے ۔

اقامہ حدود میں آپ کے عزم و ارادہ اور سطوت و قوت کی عجیب شان تھی وہ سابقہ خلافتیں تھیں جن میں کمزوروں پر حد آسانی سے جاری

سلہ نہج البلاغہ صنا ۲ہ نہج البلاغہ صنا ۳ہ نہج البلاغہ صنا

ہو جاتی تھی مگر طاقتور یا خاندانی امتیاز رکھنے والوں کے ساتھ مراعات ضروری سمجھی جاتی تھی۔ خالد بن الولید سے مالک بن نویرہ کا قصاص اس لئے نہ لیا گیا کہ وہ "سیف اللہ" بن چکے تھے۔

حضرت عثمان نے عبید اللہ بن عمر سے ہرمزان کے قتل کا قصاص اس لئے نہ لیا کہ وہ خلیفہ زادے تھے۔

جب حضرت علیؑ خلیفہ ہوئے تو عبید اللہ کو اپنے متعلق اندیشہ پیدا ہوا اور اس لئے وہ بھاگ کر شام چلے گئے آخر صفین میں قتل ہوئے لہ

حضرت علیؑ کے عزم و ارادہ کی اس بارہ میں یہ شان تھی کہ فرماتے تھے ؎۔

الذلیل عندی عزیز حتی اٰخذ الحق لہ والقوی عندی ضعیف حتی اٰخذ الحق منہ۔

"کمزور شخص میرے نزدیک طاقتور ہے یہاں تک کہ اُس کا حق میں حاصل کروں اور طاقتور میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ اُس سے حق کو وصول کروں"۔

حضرت عمر نے اپنے سالے قدامہ بن مظعون پر شراب خواری کی حد جاری کرنے میں جتنا تامل مشورہ اور حیلہ بہانہ کیا ہے وہ ایک طویل

لہ استیعاب مطبوعہ حیدرآباد ج ۲ ص ۴۲۱ ؎ نہج البلاغہ ص ۹۷-۹۸

داستان ہے ؂ مگر حضرت علی اس معاملہ میں اتنے بے لوث تھے کہ اپنے عزیز چچازاد بھائی کو صرف مال کے معاملہ میں بے اعتدالی پر تحریر فرماتے ہیں ؂

فاتق الله واردد الیٰ ھؤلاء القوم اموالھم فانک ان لم تفعل ثم امکننی الله منک لاعذرن الی الله فیک ولاضربنک بسیفی الذی ماضربت بہ احد الا دخل النار وو الله لو ان الحسن والحسین فعلا مثل الذی فعلت ماکانت لھما عندی ھوادۃ ولاظفرا منی بارادۃ حتی اخذ الحق منھما وازیل الباطل عن مظلمتھما۔

"خدا سے ڈرو اور ان لوگوں کے ان کے اموال واپس کردو اگر تم نے ایسا نہ کیا اور خدا نے مجھے موقع دیا تو میں خدا کی بارگاہ میں تمہارے بارے میں اپنی جوابدہی کا سامان کرونگا اور تم کو اپنی اسی تلوار کی ضرب لگاؤنگا جس سے میں نے کسی کو نہیں مارا ہے مگر یہ کہ وہ آتش جہنم میں داخل ہوا اور خدا کی قسم اگر حسنؑ و حسینؑ ایسا کرتے تو ان کے لئے بھی میرے پاس کوئی رعایت نہ ہوتی اور نہ مجھ سے وہ اپنا مطلب نکال سکتے یہاں تک کہ میں حق کو ان سے لے لیتا اور باطل کو ان کے ظلم سے برطرف کردیتا"۔

یہ ہیں علی ابن ابیطالب اور یہ ہے ان کی خلافت کی شان۔

؂ استیعاب ج ۲ ص ۵۴۹ ؂ نہج البلاغہ مطبوعہ مصر ج ۲ ص ۶۸-۶۹

بالکل غلط ہی یہ کہ اُن کو حضرت ابوبکر کی خلافت سے اختلاف کے اظہار کی جرأت نہیں ہوئی۔ اُنھوں نے برابر اظہار کیا، اور اگر اظہار نہ کرتے تو آج ساڑھے تیرہ صدی کے بعد وہ اس درجہ ظاہر نہ ہوتا کہ "م ح" صاحب کو بھی با دل ناخواستہ اقرار کرنا پڑ رہا ہے کہ

"یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت سے اُن کو انکار و اختلاف تھا" لیکن پھر بھی جنگ کو وہ مفاد اسلامی کے لئے مضر سمجھتے تھے۔

یہ بھی اُن کی قوت ارادی اور عزم کی شان تھی کہ باوجود طاقت جسمانی کے پھر بھی مصلحت کو مقدم کیا اور کمزور ارادہ اور رائے کے اشخاص کی طرح ورغلانے والوں اور سبز باغ دکھانے والوں سے متاثر نہیں ہوئے۔

ابوسفیان ایسا صاحب قوم و قبیلہ شخص جس کے راضی کرنے کے لئے مالک تاج و تخت اور صاحب شان و شوکت اور "م ح" صاحب کے الفاظ میں دبنگ انسان حضرت عمر کو بھی شام کا پورا علاقہ ہمیشہ کے لئے فروخت کر دینا پڑا اور تیسرے دور کے واسطے بنی امیہ کے لئے جگہ بھی دینا پڑی۔ وہ علی بن ابیطالبؑ کو نصرت کے پورے وعدہ کے ساتھ ان الفاظ میں آمادہ کرتا ہے کہ "میں مدینہ کو سوار و پیادہ سے

پھر دونگا اور علی اُس کو یہ کہہ کر ڈانٹ دیتے ہیں کہ تو ہمیشہ سے اسلام کا دشمن رہا ہے [۱]

وہ علم جیسے آپ فرماتے تھے کہ تمھیں نہیں حاصل ہے یہی ہے کہ اس وقت جنگ کرنا اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا سبب ہے۔

اسی لئے رسول اللہ کی وصیت بھی سکوت کے لئے تھی جس کا آپ نے ایک اور موقع پر حوالہ دیا ہے [۲]

یہ آپ نے کبھی نہیں فرمایا کہ میں مستحق خلافت نہیں ہوں - بلکہ صاف ارشاد کیا [۳]

لقد علمتم انی احق الناس بھا من غیری "تم لوگوں کو معلوم ہے کہ میں اس خلافت کا سب سے زیادہ مستحق ہوں" آپ نے حضرت عثمان کے بعد قبول خلافت سے انکار ضرور کیا مگر اس کا سبب بھی بیان کر دیا کہ جمہور کا مزاج اخلاقی اتنا خراب ہوگیا ہے اور عادتیں اتنی بگڑ گئی ہیں کہ وہ میرے بے لوث ہدایات پر عمل کے قابل نہیں رہے ہے [۴]

دعونی والتمسوا غیری فانا مستقبلون امرا لہ وجوہ والوان لا تقوم لہ القلوب ولا تثبت علیہ العقول وان الآفاق قد اغامت

---

[۱] استیعاب ج ۲ ص ۱۰ صواعق محرقہ ص ۳۱ [۲] نہج البلاغہ ج ۱ ص ۹۵

[۳] نہج البلاغہ ج ۱ ص ۱۳۵ [۴] نہج البلاغہ ج ۱ ص ۱۹۵

والمحجة قد تنکرت واعلموا انی ان اجبتکم رکبت بکم ما اعلم ولم اصغ
الی قول القائل وعتب العاتب وان ترکتمونی فانا کاحدکم۔

"معاف کرو مجھ کو کسی اور سے کہو۔ کیونکہ ہمارے سامنے ایسا معاملہ
درپیش ہے جس کے بہت سے رخ ہیں اور مختلف پہلو ہیں۔ دل اس کے
لئے برقرار نہیں رہ سکتے اور عقلیں اس کے لئے ٹھہر نہیں سکتیں
اور فضا پر ابر چھا گیا ہے اور راستہ (شریعت کا) ناشناس ہو گیا
ہے۔ اور میں نے اگر تمھاری خواہش کو قبول کیا تو میں تم کو اپنے علم کے
مطابق چلاؤں گا اور کسی کہنے والے کے قول اور معترض کے اعتراض
کو نہیں سنونگا۔ اور اگر تم نے مجھ کو چھوڑ دیا تو میں تمھارا ہی ایسا ایک
فرد ہونگا"

کتنی جسارت ہے یہ کہ اس کلام کا پہلا اور آخری جزء صرف لیکر
یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ حضرت علی اپنے تئیں مستحق خلافت نہیں سمجھتے تھے
یہ ظاہر ہے کہ اگر اس صورت میں کسی دوسرے کو خلیفہ مقرر کر دیا جاتا
تو حضرت علی انتظام ملکی میں اس سے احکام پر سب سے زیادہ ہی عمل کرتے
جیسا کہ ایک با اصول انسان کا وطیرہ ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ خلافت
حقیقیہ کا سوال ہی درپیش نہیں تھا۔ بلکہ تمام لوگوں کے اعتقاد کے
مطابق صورت یہی تھی کہ وہ لوگ آپ کے سامنے اسی طرح حکومت

پیش کر رہے تھے جس طرح اس کے پہلے کے لوگ مسند خلافت پر عام اشخاص کی جانب سے متمکن ہوتے تھے اس لئے حضرت علی کے یہ ارشاد سے کہ "جس کو تم حاکم بناؤ گے اُس کی میں اطاعت کرونگا" یہ نتیجہ کس طرح نکالا جاسکتا ہے کہ حقیقۃً خلافت کے لئے عام پبلک کے اختیار کا نظریہ درست ہے اور اُس کا تقرر خدا کے ذمّہ نہیں ہے۔ جبکہ خدا کی قرار داد کو اس مسئلہ میں تسلیم ہی نہیں کیا گیا اور نظام دوسری صورت سے قرار پا چکا اور اُسی نظام کے مطابق انتخاب کا سوال درپیش ہے۔

یہ بھی علیؑ بن ابیطالب کی قوت ارادی کی انتہا ہے کہ طاقت و قوت کے باوجود صرف مصالح اسلامی کے لئے رسول کے بعد اے دور میں مظالم بھی برداشت کئے مگر جو طریقۂ کار اختیار کر لیا تھا اُس میں سرمو فرق نہ ہوا۔

آپ کی شجاعت و قوت کے لحاظ کے ساتھ جو ابتدا میں بدر واحد و خندق و خیبر، اور آخر میں جمل صفین و نہروان کی صورت میں مشاہدہ میں آ چکی جتنا آپ پر سختی و ظلم کے واقعات زیادہ دہرائے جائیں گے اُن سے آپ کی قوت نفس، قوت ارادہ اور عظیم ثبات و استقلال و تحمل ہی کی صفت پر روشنی پڑتی جائے گی۔

کیا اثر پڑ سکتا ہے حقیقت واقعہ پر اس روایت کا کہ حضرت فاطمہ نے آپ کے سکوت پر سخت الفاظ میں اعتراض کیا اور عبرت انگیز الفاظ کہے یا نہیں۔

جانے دیجئے کہ روایت کہاں تک صحیح ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس میں بات ہی کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ دو ہی صورتیں ہیں یا تو سیدۂ عالم فاطمہ زہرا جیسا کہ شیعوں کا عقیدہ ہے معصومہ اور غیر جائز الخطا تھیں اور یا جیسا کہ عام مسلمانوں کا خیال ہے ایسا نہیں تھا۔

پہلی صورت میں شیعہ لوگ اس کی نظیریں پیش کرتے ہیں۔ ملائکہ کا خدا پر اعتراض (اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفک الدماء) ابراہیم کا خدا سے مجادلہ کرنا (یجادلنا فی قوم لوط) موسیٰ کی ہارون پر سختی (یا ابن ام لا تأخذ بلحیتی ولا براسی) وہ کہتے ہیں کہ جس طرح ان مقامات پر حقیقتہ نزاع نہیں ہے۔ اعتراض نہیں ہے جنگ نہیں ہے بلکہ دوسروں پر اظہار حقیقت کی ایک صورت ہے۔ اسی طرح یہاں بھی واقعی اعتراض اور جنگ نہیں ہے بلکہ دوسروں پر اس حقیقت کا انکشاف کرنا تھا کہ اتنے اظہار ناگواری کے باوجود کتنا عظیم ہے وہ مفاد جو علی بن ابیطالبؑ کو مخالفت سے مانع ہے چنانچہ اس روایت میں یہ ہے کہ اسی وقت جب سیدؑ علیؑ کے مصروف شکوہ تھیں، موذن نے اذان دی اور جناب امیرؑ نے کہا دیکھو میں تلوار اٹھا لوں مگر یہ آواز تم کو سنائی نہ دیگی۔ یہ سن کر سیدہ خاموش ہو گئیں۔

یہ اس صورت میں ہے جب سیدہؑ کو معصومہ مانا جائے اور اگر عام مسلمانوں کی طرح یہ عقیدہ نہ رکھا جائے تو ظاہر ہے کہ ایک عورت کا دل و دماغ ان تمام

مصالح و اسرار تک نہیں پہونچ سکتا جو ایک مدبر اور بڑے عقل و فکر والے مرد کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر جناب فاطمہ نے اس طرح کا شکوہ کیا کیا ہو تو اس سے علی بن ابیطالب کے طریقۂ کار کی صحت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

نا قابل برداشت مصیبت کی بنا پر علی بن ابیطالبؑ ایک جذباتی انسان قرار پا جاتے اگر وہ صرف ایسے غیرت انگیز الفاظ کو سن کر متاثر ہو جاتے اور اپنے طریقۂ کار میں تبدیلی کرتے جو بڑی حکمت و مصلحت مبنی کا نتیجہ تھا۔

اس سے تو علی بن ابیطالبؑ کی قوت ارادی اور بلندئی حوصلہ کا اندازہ ہوتا ہے نہ یہ کہ اس کے خلاف کوئی نتیجہ برآمد ہو۔ کیا ان روشن حقائق کی موجودگی میں صرف خلفائے ثلاثہ سے عقیدت کی بنا پر علی بن ابیطالب کی بلندئی مرتبت کا انکار کیا جا سکتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ خلافت کے مستحق نہیں تھے بلکہ خلفائے ثلثہ مستحق تھے۔

اس تنقیح کو اب اس سے زیادہ کیا بڑھایا جائے۔ حالانکہ بہت باتیں پھر بھی تشنۂ تفصیل رہ گئیں۔ لیکن اب دوسری تنقیح کا انتظار کیجئے۔

چوتھی تنقیح

آیات سے استدلال کا معیار اور اخبار و احادیث کا درجہ

اس تنقیح کا سنگ بنیاد یہ ہے کہ مسئلہ امامت و خلافت میں نص خدا و رسول کے ثابت کرنے میں کچھ آیات قرآنی پیش کیے گئے تھے جن کی مستند تفسیر خلافت علی بن ابیطالب کے لئے قطعی دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے برمی صاحب اور "م ح" دونوں بزرگواروں کی جانب سے یہ شکایت کی گئی ہے کہ استدلال میں آیات کے ساتھ احادیث و اخبار کا ضمیمہ لگا دیا ہے اور اس لئے صرف قرآن سے حضرت علی کی خلافت ثابت نہیں ہوئی ہے۔ "م ح" صاحب تو اس کو "ایک گہری مناظرانہ چال" اور "علمی فریب کاری" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور برمی صاحب اُسے "شیعہ حضرات کی بیکسی" کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ دیکھنا ہے کہ ان حضرات کی یہ شکایت صحیح ہے یا نہیں۔

یہ موجودہ زمانہ میں ایک فیشن ہو گیا ہے یا روشن خیالی کا مظاہرہ کہ قرآنی آیات سے مطالب کے استخراج کے لئے اخبار

روایات کی مدد لینے سے انکار کیا جاتا ہے لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں تو بغیر خارجی روایات اور اخبار کے سہارے کے آپ قرآن کے معانی میں ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔

کسی اور چیز کا کیا ذکر ہے میں تو کہتا ہوں کہ خود قرآن سے یہ تک ثابت نہیں ہو سکتا کہ وہ حضرت محمد مصطفےٰ کے شخص خاص پر نازل ہوا ہے اُس میں کہیں رسول اللہ سے یا محمد کہہ کر بات ہی نہیں کی گئی۔ ہر جگہ اوصاف کا ذکر ہے لیکن موصوف کی تعیین اُن اوصاف کے لئے صرف قرائن اور خارجی روایات کی مرہون منت ہے۔ وہی قرائن جن سے مدد لینے کی ضرورت پر آپ خلافت کے مسئلہ کو قرآن سے بیگانہ بنا دینا چاہ رہے ہیں۔ فرض کیجئے کہ اُس میں یہ آیت ہے:۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فأتوا بسورۃ من مثلہ

"اگر تم کو کسی طرح کا شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے تو اس کے مثل ایک سورہ بنا لاؤ۔"

اس میں رسول اللہ کو "عبدنا" کی لفظ سے یاد کیا گیا ہے لیکن یہ امر کہ "ہمارے بندہ" سے مراد رسول اللہ ہی ہیں قرآن میں تو نہیں لکھا ہے۔ رسول اللہ کی عصمت کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:۔

ما ضل صاحبکم وما غوی وما ینطق عن الھوی ان ھو

الّا وحیٌ یوحیٰ۔

یہاں "صاحبکم" کی لفظ سے رسول اللہ کو مراد لیا گیا ہے مگر کیا اس کی صراحت قرآن میں موجود ہے۔

قرآن میں: انّا فتحنا لک فتحا مبینا "ہم نے تمھیں ایک کھلی ہوئی فتح عطا کی ہے"۔

"یہ تمھیں" کا خطاب رسول اللہ سے ہے۔ فتح ان کو دی گئی اور کھلی ہوئی فتح۔ کب اور کس طرح؟ یہ تمام باتیں قرآن میں تو نہیں موجود ہیں جہاں تک دیکھا جاتا ہے جس حد تک سابقہ امتوں کا اور انبیاء کا ذکر ہے ایک حد تک قرآن نے تصریح و بیان سے کام بھی لیا ہے مگر جہاں تک رسول اللہ اور اس امت کے متعلقہ واقعات کا تذکرہ ہے اس میں اسی طرح کی چیزیں ہیں جن کی تعیین بغیر قرائن خارجی کے ممکن ہی نہیں۔

قرآن مجید کو کھولئے اور شروع سے پڑھتے چلے جائیے:۔

الٓمٓ اسے تو جانے ہی دیجئے۔ یہ بالکل راز ہے ذلک الکتاب لاریب فیہ "وہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں" وہ کتاب سے کیا مراد؟ قرآن! مگر یہ خود قرآن میں اس مراد کی تو تصریح نہیں ہے ——

والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک

"وہ جو ایمان لاتے ہیں اس شے پر جو تم پر نازل ہوئی اور جو تمھارے

قبل کے لوگوں پر نازل ہوئی تھی "! یہ کس سے کہا جا رہا ہے؟ رسول سے۔ مگر قرآن میں تو یہ نہیں درج ہے ۔۔۔ وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا ۔۔۔ اس کے متعلق تو اس کے پہلے تبصرہ کیا جا چکا ہے کہ "عبدنا" کا مفہوم بالکل مبہم ہے اور تعیین قرآن میں موجود نہیں ہے۔

سیقول السفہاء من الناس ما ولّٰہم عن قبلتہم التی کانوا علیہا۔ "کم عقل لوگ کہیں گے کہ یہ لوگ اُس قبلہ سے کیوں پلٹے جس پہ پہلے تھے"۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے کوئی اور قبلہ تھا پھر اُس سے عدول کیا گیا۔ مگر وہ پہلا قبلہ کون سا تھا اور اب کس کی جانب عدول ہوا؟ یہ قرآن میں موجود نہیں ہے ۔۔۔ الحج اشہر معلومات حج کے لئے معینہ مہینے ہیں" وہ کون سے ہیں؟ قرآن میں کچھ پتہ نہیں ہے" اور لئک عن الشہر الحرام قتال فیہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مہینے میں جنگ حرام ہے۔ مگر وہ کون مہینہ ہے کچھ ذکر نہیں۔

قرآن ایک موقع کی تصویر کھینچ رہا ہے:۔

واذ تصعدون ولا تلوٗن علی احد والرسول یدعوکم فی اخرٰکم "جب تم چڑھے جا رہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور رسول تمہیں پیچھے سے آواز دے رہا تھا"

بے شک ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا کسی وقت یہ عالم ہوا تھا۔

مگر وہ کون موقع تھا اور کس لڑائی میں ایسا ہوا؟ یہ قرآن میں صراحت نہیں ہے۔

انّ الّذین تولّوا منکم یوم التقی الجمعان

"وہ لوگ جنھوں نے تم میں سے پیٹھ پھرائی اُس دن جب دونوں لشکروں میں مُڈبھیڑ ہوئی۔"

بے شک معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں کیلئے یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ لیکن وہ لوگ کون تھے اور وہ دن کیا تھا؟ اس کی تصریح نہیں ہے۔

وما اصابکم یوم التقی الجمعان فباذن اللّٰہ" اور وہ بات جو تمھیں درپیش ہوئی اُس دن جب دونوں لشکروں میں مقابلہ ہوا تھا وہ خدا کی مشیّت سے تھی"۔ اب وہ بات کیا ہے جو درپیش ہوئی کچھ ذکر نہیں

کما اخرجك ربك من بیتك بالحق وانّ فریقا من المؤمنین لکارھون۔ "جیسے نکالا تمھارے پروردگار نے تم کو تمھارے گھر سے سچائی کے ساتھ درصورتیکہ ایک جماعت مسلمانوں میں سے کراہت رکھتی تھی"۔

واذ یعدکم اللّٰہ احدی الطائفتین انھا لکم وتودّون انّ غیر ذات الشوکۃ تکون لکم۔

"اور اُس وقت جب وعدہ کر رہا تھا تم سے خدا دونوں جماعتوں میں سے ایک کا کہ وہ تمہارے لئے ہو گی اور تم آرزو رکھتے تھے کہ وہ جو شان و شوکت والی نہیں ہے وہ تمہارے لئے ہو"۔

"دونوں جماعتوں میں سے ایک"، کیا معنی؟ غیر ذات الشوکۃ سے کیا مراد؟

فلم تقتلو ھم ولکن اللہ قتلھم وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ۔

"تم لوگوں نے اُن کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے ان کو قتل کیا اور (اے رسول) تم نے نہیں پھینکا جبکہ پھینکا لیکن خدا نے پھینکا"۔

رسول نے کیا چیز پھینکی تھی اور کب؟ قرآن میں تو صراحت نہیں ہے۔

اذ انتم بالعدوۃ الدنیا وھم بالعدوۃ القصوی والرکب اسفل منکم ولو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد ولکن لیقضی اللہ امرا کان مفعولا۔

"جبکہ تم قریب کی جگہ تھے اور وہ دور کی جگہ تھے اور سوار تمہارے ادھر تھے اور اگر تم ایک دوسرے سے وعدہ کرتے تو یقیناً وعدہ میں اختلاف پیدا ہوتا لیکن خدا کو تو پورا کرنا تھا جو کچھ اُسے منظور تھا"۔

اذ یریکھم اللہ فی منامک قلیلا ولو اراکھم کثیرا

لفشلتم ولتنازعتم فی الامر۔

"جبکہ خدا تمھارے سامنے پیش کرتا تھا انھیں تمھارے خواب میں کم اور اگر وہ تمھیں زیادہ دکھائی دیتے تو تم سست ہو جاتے اور تم میں اختلاف پیدا ہو جاتا۔"

کیا یہ اشارے نہیں ہیں واقعات کی طرف جن کی تفصیل مذکور نہیں ہے۔

ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین وان یکن منکم مائتہ یغلبوا الفامن الذین کفروا۔

"اگر تم میں سے بیس آدمی ثبات قدم رکھنے والے ہوں تو دو سو پر غالب آئیں اور اگر تم میں سے سو ہوں تو ہزار کافروں پر غالب آئیں۔"

اس کے بعد ارشاد ہوا ہے۔

الآن خفف اللہ عنکم وعلم ان فیکم ضعفا "اب خدا نے تم سے تخفیف کر دی اور سمجھ لیا کہ تم کمزور ہو"۔ یہاں کہا گیا ہے "اب" مگر وہ اب کب تھی؟ اس کا پتہ لگانا یہاں مشکل ہے۔

اجعلتم سقایۃ الحاج وعمارۃ المسجد الحرام کمن آمن باللہ والیوم الآخر وجاھد فی سبیل اللہ۔

کیا تم نے قرار دیا ہے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا مثل اس شخص کے جو مبدأ و معاد پر ایمان لایا ہو اور خدا کی راہ میں جہاد کرے"

صاف ظاہر ہے کہ دو شخصوں میں موازنہ ہے۔ مگر وہ دونوں فریق کون کون تھے۔ موازنہ کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ یہ نہیں معلوم۔

انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا۔

"مشرک لوگ نجس ہیں۔ یہ لوگ مسجد الحرام کے قریب نہ جائیں اس سال کے بعد"

اس سال یعنی کون سال؟ یہ تاریخ سے حل ہوگا۔

اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذ ھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا۔

"جب کفار نے رسول کو گھر سے نکال دیا اور وہ دو میں کے ایک تھے جبکہ وہ دونوں غار میں تھے۔ جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ رنج نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے"

رسول اللہ کے ساتھ دوسرا شخص کون تھا؟ صاحب سے کیا مراد ہے؟ یہ باتیں مسکوت عنہ ہیں

وعلی الثلٰثۃ الذین خلفوا حتی اذا ضاقت علیھم الارض بما رحبت وضاقت علیھم انفسھم وظنوا ان لا ملجأ من اللہ الیہ ثم تاب علیھم لیتوبوا

"اور خدا نے توبہ قبول کی اُن تین کی جو پیچھے رہ گئے تھے یہاں تک کہ جب اُن پر زمین تنگ ہوگئی اور خود اُن کے نفوس تنگی کرنے لگے اور

اُنھیں یقین ہوا کہ خدا سے بس اُسی کی طرف پناہ مل سکتی ہے تو خدا نے اُن کی توبہ کو قبول کیا۔"

یہ تین کون ہیں؟ اس کا ذکر نہیں۔

ولقد علمنا المستقدمین منکم ولقد علمنا المستأخرین۔ "ہم نے خوب جان لیا اُن لوگوں کو تم میں سے جو آگے رہنا چاہتے ہیں اور اُن لوگوں کو بھی جو پیچھے رہنا چاہتے ہیں۔"

کس مقام پر آگے اور پیچھے رہنا۔ رزم میں یا بزم میں۔ ایمان میں یا عبادت میں؟ یہ کچھ پتہ نہیں چلتا۔

ولقد نعلم انھم یقولون انما یعلمہ بشر لسان الذی یلحدون الیہ اعجمی وھذا لسان عربی مبین۔

"ہمیں معلوم ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں رسول کو ایک شخص تعلیم دیتا ہے۔ زبان اُس شخص کی جس کی طرف یہ نسبت دیتے ہیں عجمی ہے اور یہ کھلی ہوئی عربی زبان ہے۔"

اب بتائیے وہ کون شخص ہے جس کی طرف نسبت دی جاتی تھی۔

سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حولہ

"پاک ہے وہ خدا جس نے سیر کرائی اپنے بندہ کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف جس کے گرد و پیش برکت قرار دی گئی ہے۔"

یہاں بھی بعبدہٖ کی لفظ ہے جس سے یہ معلوم ہونے کی ضرورت ہے کہ کون مراد ہے پھر یہ مسجد اقصیٰ کون ہے جہاں تک سیر کرائی گئی تھی

ان الذین جاء و بالافک عصبۃ منکم لاتحسبوہ شرالکم

بل ھو خیر لکم لکل امرئ منھم ما اکتسب من الاثم والذی تولّٰی کبرہ منھم لہ عذاب عظیم لولا اذ سمعتموہ ظنّ المؤمنون والمؤمنات بانفسھم خیرا وقالوا ھذا افک مبین لولا جاؤوا علیہ باربعۃ شھداء فاذ لم یأتوا بالشھداء فاولٰئک عند اللہ ھم الکاذبون۔

"وہ لوگ جو تہمت لیکر آئے ہیں تمھیں میں سے کچھ لوگ ہیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ یہ تمھارے لئے کچھ برا ہے بلکہ وہ تمھارے لئے اچھا ہے۔ ہر ایک کے لئے اُن میں سے وہ ہے جس کا وہ مرتکب ہوا ہے گناہ سے اور جو شخص اُس کا بڑا ذمہ دار ہے ان میں سے اُس کے لئے بڑا عذاب ہے کیوں نہ جب تم لوگوں نے اُس تہمت کو سنا تو مومنین اور مومنات نے اپنے دل میں اچھا خیال کیا اور یہ کہا کہ یہ کھلی ہوئی تہمت ہے۔ کیوں نہ اُن لوگوں نے اُس پہ چار گواہ پیش کئے۔ اب جبکہ وہ گواہ نہیں پیش کر سکے تو یہ لوگ خدا کے نزدیک جھوٹے ہیں۔"

اب ملاحظہ کیجئے کہ کیا تہمت ہے؟ کس پر تہمت ہے؟ کون لوگ لانے والے اس کا کچھ ذکر نہیں۔

پھر بھی یہ منصوصات قرآن سے سمجھا جاتا ہے۔ مسلمانوں سے پوچھو کہ اگر کوئی قضیۂ افک میں حضرت ام المومنین کو متہم سمجھے تو وہ مومن ہے

یا کافر۔ وہ کہیں گے کافر ہے اس لئے کہ نص قرآنی کے خلاف اعتقاد رکھتا ہے

وعدکم اللہ مغانم کثیرۃ تأخذونھا فعجّل لکم ھذہ وکف

ایدی الناس عنکم ـــــ واخری لم تقدروا علیھا۔

"تم سے خدا نے وعدہ کیا تھا بہت سی غنیمتوں کا پس یہ تمھارے لئے

جلدی عطا کر دیں اور اُن لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا ـــــ اور

اس کے علاوہ دوسری اُن پر تمھیں قدرت حاصل نہیں ہوئی"۔

فعجّل لکم ھذہ سے کا ہے کی طرف اشارہ ہے۔ دوسری جن پر

قدرت نہیں حاصل ہوئی وہ کیا ہیں۔ یہ تمام باتیں راز سربستہ ہیں۔

یا ایھا النّبی لم تحرّم ما احل اللہ لک تبتغی مرضات ازواجک

"اے پیغمبر تم کیوں حرام کرتے ہو اُسے جو خدا نے تمھارے لئے حلال

قرار دیا ہے۔ تم اپنے ازواج کی خوشی پوری کرنا چاہتے ہو"۔

واذ اسرّ النّبی الی بعض ازواجہ حدیثا فلما نبّأت بہ

واظھرہ اللہ علیہ عرف بعضہ واعرض عن بعض فلما نبّأھا بہ

قالت من انبأک ھذا قال نبّأنی العلیم الخبیر۔

"جب رسول نے اپنی بعض ازواج سے ایک بات چپکے سے کہی جب

اُس بیوی نے اُسے کہدیا اور خدا نے رسول پر اُس کو ظاہر کیا تو انھوں نے

کچھ بتلایا اور کچھ سے چشم پوشی کی۔ جب اُنھوں نے اُس زوجہ سے اس کی

خبر دی تو اس نے کہا کہ آپ کو کس نے بتلایا کہا مجھ کو خبر دی خدائے عالم و دانا نے۔"

ان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما وان تظاھرا علیہ فان اللہ ھو مولاہ وجبریل وصالح المؤمنین۔

"اگر تم دونوں توبہ کرو خدا سے تو اچھا ہے کیونکہ تمھارے دل کج ہو گئے ہیں اور اگر تم دونوں رسول کے خلاف متفق ہو جاؤ تو خدا اُن کا مددگار ہے اور جبرئیل اور مومنین میں سے جو صلح ہیں۔"

اس میں یقیناً ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو سے متعلق ہے۔ مگر وہ دونوں کون تھیں اور وہ راز کیا تھا اور کس نے اُسکا کس سے اظہار کر دیا تھا اور اس میں خرابی کیا تھی یہ سب باتیں بھی کیا قرآن میں موجود ہیں؟

یہ تو واقعات کا عالم ہے۔

اور احکام شرعیہ، ان میں بھی قرآن نے نماز کا حکم دیا مگر ترکیب قرآن میں نہیں بتائی گئی۔ روزہ کا حکم ہے مگر کن کن چیزوں سے روزہ میں امساک ہونا چاہیے۔ اس کا قرآن میں پتہ نہیں۔ حج کا حکم ہے مگر مناسک حج کی تعلیم نہیں ہے۔ زکوٰۃ کا حکم ہے مگر نصاب و مقدار زکوٰۃ کا پتہ نہیں۔

حقیقتہً اگر قرائن عقلیہ اور حقائق تاریخیہ سے بالکل چشم پوشی کرلی جائے تو الفاظ گنگ ہو جائیں گے اور مفہوم بالکل گم ہو جائیگا۔

اس کے لئے یا تو کہئے کہ قرآن کی متانت اس کی متحمل نہیں تھی کہ اس طرح کے تفصیلات اُس میں مذکور ہوں۔ نہیں تو قرآن توریت کی کتاب پیدائش یا سفر خروج کی طرح واقعات کا ایک خشک مجموعہ ہوتا اور اُس کی بلاغت باقی نہ رہتی اور یا کہئے کہ اس میں کوئی حکیمانہ مقصد مضمر تھا اور قرآن خود اپنے تئیں "کافی" قرار دینا نہیں چاہتا تھا۔

اب معلوم نہیں کہ ان تمام آیات میں برمی صاحب کو کوئی "خلا" نظر آتا ہے یا نہیں۔ اور اُس خلا کے پُر کرنے کا ان کے نزدیک کیا طریقہ ہے روایات سے بالکل کنارہ کشی تو ممکن ہی نہیں ہے۔ قرآن مجید کے مکی و مدنی کی تعیین، ناسخ و منسوخ کی تمیز، مورد و مصداق کی تشخیص اور اگر عبارت نہ سمجھی نہ جائے تو دبی زبان سے کہدوں کہ الفاظ تنزیل میں قرات کی ترجیح سب روایات ہی پر مبنی ہے اور اگر روایات کو کلیتہً نظر انداز کردیا جائے تو نقلی استدلال کی عمارت بالکل زمین دوز ہو جائیگی اور ادلہ شرعیہ کی اینٹ سے اینٹ بج جائیگی۔

شان نزول یعنی موقع کلام بھی ایک ایسی اہم چیز ہے جس سے الفاظ کے معانی میں زمین آسمان کا فرق پڑجاتا ہے پھر اُس کو بالکل

چھوڑ کیسے دیا جا سکتا ہے۔

یہ خیال کر لینا کہ روایات ظنی ہی ہوتے ہیں۔ کلیتہً صحیح نہیں ہے۔ قرائن اکثر وہ ہوتے ہیں جن سے روایت قطعی ہو جاتی ہے اور اس میں شک باقی نہیں رہتا۔ نیز اکثر روایت اور شان نزول کی الفاظ قرآن سے بالکل مطابقت بھی اس روایت کے قطعی طور پر صحت کی دلیل بنتی ہے بے شک اس کے لئے عقل کے کام میں لانے کی ضرورت ہے۔ مگر عقل تو احکام مذہبی میں اتنی ناگزیر چیز ہے کہ بغیر اس کے نہ خدا کی الوہیت ثابت ہے، نہ رسول کی رسالت اور نہ قرآن کی حقانیت۔

شیعوں کا عقل سے کام لینے ہی کا وہ تصور ہے جس کی بنا پر بزمی ضیا حسب شیعوں پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے قرآن میں تاویلات کا دروازہ کھولا۔

ممکن ہے ظاہریہ اور مجسمہ کی بارگاہ میں اس الزام کو کوئی مقبولیت حاصل ہو اس لئے کہ ان تاویلات کی بنا پر خدا کا بھاری بھرکم جسم، اور لانبے لانبے ہاتھوں کے ساتھ یمانی تخت پر جلوہ گر ہونا ثابت نہیں ہوتا اور قیامت میں اس کے دیدار کی حسرت بھی پامال ہو جاتی ہے مگر اہل عقل جانتے ہیں کہ جلال و جبروت الٰہی ان صحیح تاویلات کی حقانیت کا پورے طور پر متقاضی ہے اور مذہب عقل کی جانب سے اُن کی ضرورت ہے۔

بہر حال خلافت امیر المومنینؑ کے اثبات میں جو ادلّہ قرآنی پیش کئے گئے ہیں وہ تو بالکل اس سے مختلف ہیں۔ وہاں نہ کسی تاویل سے کام لیا گیا ہے اور نہ ظاہری معنی کے خلاف کوئی تصرف بلکہ قرآنی آیت کا بالکل مفہوم ہے جو پیش کیا گیا ہے۔

شان نزول بھی بالکل وہ ہے جس کو خود قرآن کے الفاظ صاف بتلا رہے ہیں اور اس کے خلاف جتنے اقوال ہیں اُن کی خود الفاظ قرآنی صاف صاف نفی کرتے ہیں۔ اس پر سابق کے مضامین میں کافی تبصرہ کیا گیا ہے مگر مصلحتہً نجمی صاحب اور "م رح" دونوں ہی بزرگواروں نے اُن استدلالات پر بحث کرنے سے بالکل ہی چشم پوشی اختیار کی ہے

بساط بحث کو پھیلانے کے لئے خواہ مخواہ ادلّہ خلافت میں لیس البرّ بان تأتوا البیوت من ظهورها ولکن البرّ من اتّقی و أتوا البیوت من ابوابها کی آیت کو اپنی جانب سے بڑھا دیا گیا ہے حالانکہ اثبات خلافت کے ادلہ میں مستقل طور پر اس کو کبھی ذکر نہیں کیا گیا۔ ایک دفعہ خطائے اجتہادی کی بحث میں ضمناً اس کو رسول اللہ کی حدیث (انا مدینة العلم وعلیٌّ بابها فمن اراد العلم فلیأت الباب) کا مؤید بتایا گیا تھا۔ لیکن آیت کا کسی حدیث کی تائید کرنا اور چیز ہے اور مستقل طور سے اُس کا دلیل خلافت ہونا دوسری چیز۔

دوسری آیت | الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔

اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ "قرآن کی زیر بحث آیت کے مفہوم میں کوئی ایسا خلا یا نقص نہیں ہے جس کے پیش نظر اسے کسی دوسری بات سے متعلق کرنا یا کسی حدیث کے ساتھ اُسے ضم کرنا قرین عقل قرار دیا جائے"۔

لیکن ہر عربی داں یہ سمجھ سکتا ہے کہ الیوم میں الف لام عہد کا ہے اور اُس سے اشارہ روز معین کی طرف ہوتا ہے الیوم کے معنی ہوئے "آج" اور اس کا مشارٌ الیہ وہی دن ہے جس میں یہ آیت نازل ہوئی اور پھر اُس دن میں کوئی خصوصیت ہونا چاہئے جس کی بناء پر کہا جائے کہ آج دین کامل ہوا اور آج نعمت تمام ہوئی اور اسلام دین پسندیدہ قرار پایا۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن خود بتلا رہا ہے کہ وہ کسی دوسری بات سے متعلق ہے۔ اب اگر اُس بات کو کوئی حدیث بیان کر رہی ہے اور وہ قرآنی الفاظ کے بالکل مطابق بھی ہے تو اُس حدیث کو نظر انداز کرنا کہاں تک قرین عقل ہوگا۔

تیسری آیت | انذر عشیرتک الاقربین و اخفض جناحک

لمن اتبعك من المؤمنين۔

اس پر گذشتہ مضمان میں بہت سیر حاصل بحث کی گئی تھی اور داخلی و خارجی قرائن سے پورے طور پر ثابت کر دیا گیا تھا کہ آیت واقعۂ خاص سے متعلق ہے اور بیعت عشیرہ کے واقعہ کے بالکل مطابق ہے۔

بزمی صاحب نے اُن بیانات کی رد کئے بغیر اس جگہ یورپ و امریکہ کے مستشرقین، چین و جاپان کے آدمی، فلپائن اور آسٹریلیا کے انسان ان سب کو اکٹھا کر لیا۔ فرماتے ہیں کہ:۔

"اگر کسی ایک جگہ سے بھی یہ آواز اُٹھے کہ یہ آیت کسی نوع سی بھی کسی واقعۂ خاص سے متعلق معلوم ہوتی ہے اور بجائے خود کسی مضبوط و مکمل صداقت کی حامل نہیں ہے تو میں سپر ڈالنے کو طیار ہوں"۔

مجھے افسوس ہے کہ تقلید مغرب کے ساتھ دلدادگی مجھے اس حد تک حاصل نہیں ہوئی ہے کہ میں خالص مذہبی مسائل اور قرآن کی تفسیر میں بھی یورپ و امریکہ کے افراد سے فیصلہ کرانے ہی پر حقانیت کا دارومدار قرار دوں۔ میرے نزدیک تو اسلامی مفسرین کے اقوال ایسے مسائل میں بدرجہا یورپ و امریکہ کے مستشرقین اور چین و جاپان کے افراد اور فلپائن اور آسٹریلیا کے رہنے والوں کے خیالات سے زیادہ مستند ہیں۔

"م ح" صاحب نے اس مقام پر "آزاد خیال شیعہ" کو خفض جناح کے

محاورہ پر توجہ دلائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:-

"خفض جناح عربی کا محاورہ ہے جس کا اردو میں با محاورہ ترجمہ "فروتنی" کسرِ نفسی یا خاکساری کے ساتھ پیش آنے کے ہیں۔" مگر اُنھوں نے "آزاد خیال شیعہ" کے گزشتہ مقالہ کو غور سے نہیں ملاحظہ فرمایا۔ وہاں اس محاورہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ اس آیت میں "خفض جناح" کے یہ معنی قرار دینا رسول کے بلند اخلاق پر حملہ ہے۔ وہ رسول ایسا تھا کہ نافرمان مومنین کا کیا ذکر، کفار تک سے حسنِ اخلاق کے ساتھ پیش آتا تھا۔ پھر خاص اُس شخص کے لئے مومنین میں سے جو آپ کا اتباع کرے، اُن معنوں سے "خفض جناح" کے حکم دینے کا حاصل کیا ہوا۔ من اتّبعك من المؤمنین کی خصوصیت بتلاتی ہے کہ واخفض جناحك سے اعتراف خدمات کی کوئی خاص صورت مراد ہے اور اس کے مطابق ہے بالکل وہ تفسیر جو بیعت عشیرہ کے واقعہ کے متعلق وارد ہوئی ہے اس سے معلوم ہوگا کہ اس مقام پر واخفض لهما جناح الذل من الرحمة کی آیت کو پیش کرنا بالکل بے محل ہے

یہ کون کہتا ہے کہ (واخفض جناحك) کے لفظی معنی ہیں "خلیفہ بنا دو" تاکہ یہی دوسرے مقام پر بھی ظاہر ہو جاتا۔ پھر یہ ظاہر ہے کہ مجازی معنی قرینۂ مقام کے پابند ہوتے ہیں اور ہر جگہ ان میں عمومیت کا پایا جانا ضروری نہیں ہے

چوتھی آیت

انما ولیکم اللہ و رسولہ و الذین امنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ و یؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون۔

بزمی صاحب نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے "تمھارا رفیق تو صرف اللہ ہے اور اُس کا رسول اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، اور زکوۃ دیتے ہیں اور عجز و انکساری سے زندگی گذارتے ہیں۔"

اس میں حقیقت پوشی کے لئے حسب ذیل تصرفات کئے گئے ہیں۔

(۱) ولی کے معنی "رفیق" حالانکہ آیت کا لب و لہجہ بالکل اس کے خلاف ہے۔ رفاقت کا درجہ ہر مومن کو بہ نسبت دوسرے مومن کے حاصل ہونا چاہئے۔ اس کے لئے اتنے تاکید و اہتمام کی کوئی ضرورت نہیں ہے

(۲) وھم راکعون کو بجائے اس کے کہ وہ حال کے طور پر پہلے جملہ سے متعلق ہو مستقل جملہ قرار دے کر اُسے مستقل صفت قرار دینا یہ بھی اسلوب کلام کے خلاف ہے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو یقیمون الصلوٰۃ۔ یؤتون الزکوٰۃ کی طرح اس طرف بھی وھم یرکعون کہا جاتا، (۳) رکوع کے معنی عجز و انکساری سے زندگی گزارنے کے قرار دینا۔ یہ عرف ولغت اور اصطلاح شرع سب کے خلاف ہے۔

ترجمہ میں عبارت اعتراض کی داغ دوزی پورے طور پر کرنے کے بعد تبصرہ میں یہ کہا گیا ہے کہ " اس آیت میں کوئی ایسا ابہام و خلا نہیں ہے

جس سے حضرت علی کی خلافت پر استدلال قائم کیا جائے۔"
اس میں کیا شبہہ کہ الفاظ کے مذکورہ بالا ترجمہ کے ساتھ خلا باقی نہیں رہے گا۔ مگر آیت اپنے غلط ترجمہ کی پابند نہیں ہو سکتی۔
وہاں صاف یہ کہا گیا ہے کہ "ولی تمھارا بس خدا ہے اور رسول اور وہ مومنین جو نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اس حالت میں کہ وہ رکوع کرتے ہیں۔"
یہ چونکہ ایک غیر معمولی بات ہے لہٰذا نگاہ فیصلہ صاف بتلاتی ہے کہ یہاں کسی خاص جماعت یا فرد کی طرف اشارہ ہے جس سے یہ واقعہ علم وجود میں آیا ہے۔ اور اس کے بعد ابہام و خلا کا ہونا اور شان نزول کے ذریعہ سے اُس کی تعیین ہونا بالکل کھلا ہوا راستہ ہے۔
"م ح" صاحب نے اس آیت کے ذیل میں اپنے معیار پر بہت مبسوط بحث کی ہے اور بڑے جوش وخروش اور غیظ و غضب کا مظاہرہ فرمایا ہے۔
پہلا اعتراض تو اُن کا وہی پرانا ہے کہ آیت میں روایت کا پیوند لگایا گیا ہے۔ لیکن یہ امر پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ آیات قرآن میں اس طرح کے پیوند ناگزیر ہیں ورنہ خلافت علی بن ابی طالب کا کیا ذکر، رسالت محمد مصطفٰے بھی ثابت نہیں ہو سکتی۔
پھر دوسرا اعتراض اُن کا یہ ہے کہ "روایت کی نقل میں بڑی خیانت اور بد دیانتی سے کام لیا گیا ہے۔"

یہ بہت بڑا الزام ہے، فوراً اس کو دیکھ کر ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید حوالہ غلط دیا گیا ہوگا یا کوئی جزو روایت کا جو مخالفِ مقصود ہو ترک کر دیا گیا ہوگا۔ لیکن آپ کو تعجب ہوگا یہ سن کر کہ اس آیت کے ذیل میں چار صفحے لکھے جانے کے بعد بھی اس خیانت اور بددیانتی کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا ہے۔

لکھا ہے تو یہ کہ "درِ منثور کا حوالہ دیا گیا ہے۔ درِ منثور وہ کتاب ہے جس میں مصنف نے بغیر التزام صحت دنیا بھر کی صحیح و غلط، رطب و یابس روایات جمع کر دی ہیں کہ جس کا بیشتر حصہ صرف "خرافات" ہے۔

لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ درِ منثور اہلسنت کے بہت بڑے عالم حافظ جلال الدین سیوطی کی کتاب ہے جو کوئی غیر متعصب انسان بھی نہیں تھے اس پر اُن کی کتاب "تاریخ الخلفاء" گواہ ہے جس میں یزید کو خلفائے برحق میں شمار کیا گیا ہے۔ لہذا یہ خیال تو ہو ہی نہیں سکتا کہ انھوں نے صرف خلافت حضرت علی ثابت کرنے کے لیے خواہ مخواہ ایک درجن مصنفین کے نام اپنے دل سے لکھ دئیے ہے۔ اس لئے کم از کم ان مصنفین کی طرف اس کی نسبت تو درست ماننا ہی پڑے گا۔ اس کے بعد اُن مصنفین کو دیکھ لیجئے کہ وہ کیسے لوگ ہیں۔ خطیب۔ عبدالرزاق۔ ابن جریر۔ ابوالشیخ۔ ابن مردویہ طبرانی۔ ابن عساکر۔ عتبہ بن حکیم۔ ابونعیم۔

یہی لوگ وہ ہیں جن کے روایات دوسرے مسائل میں سر آنکھوں پر رکھے جاتے ہیں لیکن خلافت علیؑ کے متعلق اگر یہ لوگ کچھ لکھیں تو لائق گردن زدنی۔

رہ گیا ہم پر یہ اعتراض کہ ہم دوسرے روایات کو کیوں نہیں تسلیم کرتے جو اس روایت کے متضاد ہیں، تو اس کا جواب صاف ہے اس لئے کہ کسی جماعت کے وہ بیانات جو خود اُن کے موافق ہوں مخالف پر حجت نہیں ہو سکتے لیکن وہ بیانات جو اُن کے مخالف ہوں مخالف کے لئے دلیل بن سکتے ہیں۔

"ولی" کے معنی صاحب اختیار اور متصرف کے نہیں ہیں تو پھر ولی مجنون اور ولی طفل کس اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ کیا وہ صرف مددگار ہی ہوتا ہے۔

نحو کے مبتدی طالب علم بھی جانتے ہیں کہ اضافت کے لئے کسی طرح کی ملابست ہونا کافی ہے۔ اشھد ان علیا ولی اللہ میں "ولی اللہ" کے معنی کیوں نہ لیجیئے کہ خدا کی طرف سے حاکم متصرف جیسے خلیفۃ اللہ یعنی خدا کی طرف کے خلیفہ۔ اگر یہاں ولی کے معنی ناصر ہی کے ہوتے تو شیعوں کو اس پر اتنا زور دینے کی کیا ضرورت تھی اور وہ اُس کی گواہی کو جزو ایمان کیوں قرار دیتے۔

جمع کے الفاظ سے واحد کا مراد لینا قرآن مجید میں نایاب نہیں ہے۔
سورۂ منافقون ہی میں دیکھ لیجئے ارشاد ہوتا ہے۔

یقولون لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منھا الاذل

"وہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ کی طرف واپس ہوئے تو جو ہم میں زبردست ہوگا وہ کمزور کو نکال باہر کریگا"

یہاں جمع کا صیغہ وارد ہے حالانکہ باتفاق مفسرین اس کا کہنے والا صرف ایک شخص تھا

بات یہ ہے کہ جب موصوف کی شخصیت نہ ذکر ہو۔ اوصاف کے ذریعہ سے اشارہ کیا گیا ہو تو واحد اور جمع کی خصوصیت قابل لحاظ نہیں ہے۔ کیونکہ اصل تو مصداق ہے وہ اگر ایک ہے تو صفات اُس پہ منطبق ہونگے چاہے صیغہ جمع کا ہو۔ اور اگر موصوف متعدد ہیں تو صفات ان سب پر منطبق ہونگے چاہے صیغہ واحد ہو۔ جیسے من یعمل سوء یجز بہ "جو شخص برا کام کریگا اُس کو بدلا دیا جائیگا"۔ لکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر "نیکی اُس شخص کی ہے جو ایمان لائے خدا اور روز قیامت پر"۔

اس سے بڑھ کر شدید غلطی کیا ہو گی کہ وھم راکعون کو حال تسلیم کرنے کے باوجود یہ خیال ظاہر کیا جائے کہ وہ اس کے پہلے کے تمام جملوں سے متعلق ہونا چاہئے حالانکہ اس قسم کے ضمیموں کے متعلق یہ کلیہ قاعدہ ہے

کہ وہ آخر کے جملہ ہی سے ملحق ہوتے ہیں۔ پہلے کے جملوں سے متعلق کیا جانا اکثر اہل فن کے نزدیک تو ناجائز ہے اور کم از کم مشکوک تو ضرور ہے۔

"زکوۃ" کو صدقہ واجبہ ہی کے معنی میں قرار دینا درست نہیں ہے۔ خود زکوۃ دو قسم کی ہے واجب اور مستحب۔ مستحبی زکوۃ کے لئے نصاب وغیرہ کی کوئی شرط نہیں ہے۔

نماز میں زکوۃ ادا ہو جانے سے "فعل کثیر" کا ہونا کوئی ضروری امر نہیں ہے۔

"زکوۃ" کا دینا خود عبادت ہے۔ اس لئے اس کی طرف توجہ منافی رجوع قلب نہیں ہے۔

قرآن کے آیات کی ترتیب جب بالاتفاق شان نزول کے مطابق نہیں ہے تو جو بھی "لغویت" اس سلسلہ میں ہو اس کی ذمہ داری خدا پہ عائد نہیں ہوتی۔ قرآن میں اس وقت مکی مدنی آیتیں مخلوط ہیں۔ ناسخ مقدم اور منسوخ مؤخر ہے۔ ایک واقعہ کی آیتوں میں دوسری آیتیں درج ہیں۔ یہ لغویتیں کیا واقعی خدا کی تنزیل میں ہو سکتی ہیں؟

یہ بیلکہ دفعہ کہا جا چکا ہے کہ اس وقت بحث صرف خلافت حضرت علی کی ہے۔ دوسرے ائمہ کی امامت اس وقت معرض بحث

میں نہیں ہے۔ بار بار اُس بحث کو بیچ میں لانا میدان بحث سے ہٹنا نہیں تو اور کیا ہے۔

پھر یہ کہ شفاہی خطابات کی اصل وضع تو اسی کی مقتضی ہے کہ مخاطب وہی لوگ ہوں جو بوقت خطاب موجود ہیں۔ اس لئے انما ولیکم کا خطاب براہ راست اُسی طبقہ کے ساتھ ہے جو اُس وقت موجود تھا۔ اُن کے لئے خدا کی ولایت۔ رسول کی ولایت اور ایسے امام کی ولایت جو بلا فصل رسول کے بعد امر خلق کا ذمّہ دار ہونے والا تھا بتلا دی گئی۔ کیونکہ اس وقت اتنے ہی کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد جو ائمہ ہونگے اُن کا تقرر ان ہی رسول یا امام کی زبانی ہو جائیگا۔ پھر انّما کا حصر ان ولایتوں کے لحاظ سے درست ہے جو مذکورہ ولایتوں کے خلاف اور اُن سے برسر مقابلہ ہوں۔ لیکن دوسری ولایتیں اگر خود ان اولیاء کی جانب سے ثابت ہوں تو وہ خود انہی کی ولایت میں داخل ہوں گی۔ اُن کی نفی اس سے نہیں ہوگی۔

جواب میں تفصیل و اطناب مدنظر نہیں ہے ورنہ اس سلسلہ میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے

معلوم ہوا کہ اس آیت سے استدلال میں جتنے نقائص بیان کئے گئے ہیں اُن میں سے کوئی ایک بھی درست نہیں ہے۔

رہ گیا بعض متعصب علمائے اہل سنت کا انکار تو وہ تو اس دیرینہ اصول کے ماتحت ہے کہ "میٹھا میٹھا ہپ ہپ کڑوا کڑوا تھو تھو"! اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر یہ سب شیعہ ہی نہ ہو جاتے اور اہل سنت کے مذہب سے وابستہ کیوں رہتے"۔

پانچویں آیت

یا ایہا الرسول بلّغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلّغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس۔

برمی صاحب نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے " اے رسول وہ تمام چیزیں لوگوں تک پہونچا دے جو تیرے رب کی جانب سے تجھ پر نازل ہوئی ہیں۔ اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہونچایا اس کا پیغام اور اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کریگا"۔

مگر کیا واقعی یہی ترجمہ صحیح ہے؟ کیا قرآن کی بلاغت اس ترجمہ کی متحمل ہے؟ "تمام چیزیں لوگوں تک پہونچا دے۔ نہیں تو تو نے کچھ پہونچایا ہی نہیں"۔

اس کے معنی کیا ہوئے؟ سب کے ذیل میں بھی اگر کسی خاص بات پر زور دینا مقصود ہو تب تو خیر مگر وہ برمی صاحب کے مقصد کے خلاف ہی۔ اور اگر واقعی سب باتوں کو بحیثیت مجموعی ہی تبلیغ کا سوال ہے تو

اُس کے خلاف نتیجہ یہی ہوسکتا ہے کہ پوری رسالت کی تبلیغ نہیں ہوگی۔ سب نہیں پہونچایا تو کچھ نہیں پہونچایا۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ پھر یہ آیت اگر ابتدائے بعثت میں نازل ہوئی ہوتی تو خیر لیکن جب رسول اللہ اپنی تبلیغ کی پوری عمر صرف کر چکے تو یہ کہنا کہ وہ تمام چیزیں لوگوں تک پہونچا دو جو تمھارے رب کی جانب سے نازل ہوئی ہیں۔ یہ بھی اُس وقت درست ہوسکتا ہے جب رسول اللہ نے کسی خاص بات کی تبلیغ کو اب تک اُٹھا رکھا ہو اور ان الفاظ کے ذریعہ سے اُسی بات کی تبلیغ کی تاکید کی جائے۔

اب وہ بات کیا ہے؟ یہی وہ خلا، ابہام، ایجاز وغیرہ وغیرہ ہر جس کے دور کرنے کے لئے شانِ نزول کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں جو شانِ نزول درج کی گئی ہے وہ وہی ہے جو الفاظ آیت کے بالکل مطابق اور اس درجہ قرینِ صحت ہے کہ "م ح" صاحب کو بھی ان الفاظ میں اُس کا اقرار کرنا پڑا ہے کہ "یہ واقعہ ہے کہ اس آیت کی تاویل اس سے بہتر نہیں کی جاسکتی" مگر واضح ہونا چاہیے کہ اس شانِ نزول کے بیان میں تاویل کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ آیت کی کوئی لفظ اُس کے ظاہری معنی سے ہٹائی نہیں جاتی بلکہ اُس کی تنزیل ہے جو خلافت امیرالمومنین پر منطبق ہے۔

ابن تیمیہ ایسے بعض مصنفین کا اپنی ایسی کتابوں میں جو ردشیعہ ہی کے موضوع پر لکھی گئی ہیں اس روایت کو رد کر دینا تو ایک مناظرانہ پالیسی ہے جو کسی سنجیدہ فیصلہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس سے بدرجہا زیادہ اُن محدثین کا قول وزن رکھتا ہے جنھوں نے اہل سنت ہونے کے باوجود اس روایت کو درج کیا ہے اور اس کی تائید کی ہے۔

اصول کافی سے جو حدیث پیش کی گئی ہے وہ معترض کے لئے اُس وقت کارگر ہو سکتی تھی جب اُس میں آیت کو خلافت حضرت علی سے غیر متعلق بنایا جاتا۔ مگر ایسا تو نہیں ہے۔ کہا تو اُس روایت میں بھی یہی گیا ہے کہ:۔ کان کمال الدین بولایۃ علی بن ابیطالب "دین کی تکمیل ولایت حضرت علی کے ساتھ تھی"۔ جو کچھ فرق ہے وہ تاریخ کا کہ اُس میں غدیر کے بجائے یہ واقعہ عرفہ کے دن کا بتلایا گیا ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ تاریخ کے اختلاف سے اصل واقعہ میں اختلاف نہیں سمجھا جا سکتا۔

"م ح" صاحب خداوند عالم کے مقابلہ میں یہ ایراد وارد فرماتے ہیں کہ "اگر اُس کو یہی منظور تھا کہ علی ہی خلیفہ ہوں تو کیوں نہ پہلے سے ایک بڑی جماعت میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی جو اس اعلان کے سننے کے بعد اُس کے تسلیم و اعتراف میں لیت و لعل نہ کرتی"۔

اس کا جواب خود قرآن مجید نے اس آیت کے آخر میں دیدیا ہے

کہ واللہ لا یھدی القوم الظالمین" خدا ظالمین کی جبریہ ہدایت نہیں کیا کرتا"۔

ورنہ کہا جاسکتا ہے کہ نوح کو نبی بنانا ہی تھا تو ایک بڑی جماعت ایسی کیوں نہ پیدا کردی جو اُن کی تصدیق کرتی۔ طوفان کے عذاب کی نوبت ہی نہ آتی۔ اور اسی طرح تمام دوسرے انبیاء کے لئے جنھیں امتوں کے ہاتھوں طرح طرح کی تکلیفیں پہونچیں۔ بالکل ویسے ہی حضرت علی کی خلافت کا مسئلہ ہے۔

اُدھر سے صاف اعلان کردیا گیا ہے کہ

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی" دین کے بارے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ بس اتنا کافی ہے کہ ہدایت گمراہی کے طریقہ سے ممتاز ہوکر سامنے آجاوے"۔ اس کے بعد جبر و تشدد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

رہ گیا یہ امر کہ اس معاملہ کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اگر یہ نہیں تو پوری رسالت کچھ نہیں۔ اس کا راز بالکل صاف ہے۔ رسول اللہ کی عمر محدود اور آپ کی علانیہ تبلیغ کی مدت صرف تیرہ برس۔ اس میں اسلام بہت پھیلا۔ لیکن پھر بھی جزیرۃ العرب سے آگے نہیں بڑھا لیکن آپ کی رسالت کی عمر آخر قیام دنیا تک اور اُس کا دائرہ تمام دنیا

کے لئے ہمہ گیر، رسول اللہ کے زمانہ میں مسلمانوں کی ہدایت براہ راست آپکی
تبلیغ سے متعلق لیکن اس کے بعد کے لوگوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ یہی ہے
کہ آپ کی جانب سے جانشینی کا نظام قرار دیا جائے جو آپ کے بعد ہدایت
خلق کا ذمہ دار ہو سکے۔ اگر یہ نہیں ہوا تو آپ کے بعد ہمیشہ کے واسطے
مسلمان تاریکی میں مبتلا ہو گئے اور نور سے محروم کر دئے گئے۔ ظاہر ہے
کہ آپ کے بعد کے تمام مسلمانوں کی ہدایت جو رسالت کا مفاد ہے اُس
کے لحاظ سے صرف اُتنے مسلمانوں کی جو رسول کے زمانہ میں تھے زیادہ نسبت سے
جو اقلیت کے لحاظ سے کالعدم ہے اور اس لئے اگر اُن تمام مسلمانوں
کی ہدایت کا ہمیشہ کے واسطے کوئی انتظام نہ ہوا تو یہ تیرہ یا زیادہ سے
زیادہ بیس برس کی رسالت بھی بے کار رہے اور اس کا کوئی فائدہ
نہیں ہے۔

خدا نے مسئلہ خلافت کے متعلق صریحی احکام کیوں نازل
نہیں کئے، صریحی سے مراد بظاہر یہ ہے کہ نام کی تصریح کے ساتھ
اس کے متعلق پہلے کے مضمون میں کافی تبصرہ کیا جا چکا ہے۔

یہ ایک حکیمانہ روش تھی جس کی بنا پر دلائل خلافت علی
اب تک قرآن میں موجود رہ گئے۔ ورنہ اتنا بھی نہ رہتا یا آج
قرآن مسلمانوں میں متفقہ حیثیت ہی نہ رکھتا ہوتا۔

اس کے بعد "ولایت علی" کو اگر راز کہا گیا ہو تو اُس سے مقصود حضرت علی کی روحانی و معنوی وہ شان اور جلالت ہے جس کو دنیا کے عام افراد سمجھنے کے قابل نہیں ہیں۔ نہ آپ کی خلافت جو قرآن و حدیث دونوں سے ثابت ہے اور ہرگز کوئی رازِ درون پردہ نہ تھی۔

پانچویں تنقیح

حضرت علیؑ کی رائے خلفائے ثلثہ کے بارے میں

باوجودیکہ حضرت علیؑ کا خلافت ثلثہ سے اختلاف ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کا اعتراف اکثر دوسرے افراد کو بھی کرنا پڑتا ہے چنانچہ برنمی صاحب کا یہ فقرہ پہلے بھی نقل کیا جا چکا ہے:۔

"یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت سے اُن کو انکار و اختلاف تھا۔"

لیکن پھر بھی خواہ مخواہ اس کی کوشش ضروری سمجھی جاتی ہے کہ حضرت علی کے اقوال سے خلفائے ثلثہ کی خلافت کی تائید کی جائے۔ اس سلسلہ میں عام طور پر "نہج البلاغہ" کے بعض اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر امامیہ مشن کی شائع کردہ کتاب "ابوالائمہ کے تعلیمات" میں اتنی مکمل بحث کردی گئی ہے جس کے بعد

کچھ لکھنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی ۔ ناظرین کو اسی کتاب کے مطالعہ کی دعوت دینا کافی ہے ۔

برمی صاحب نے اس سلسلہ میں جو حوالے دئے ہیں وہ نہایت پُر لطف ہیں ۔

(۱) "کتاب الفتوح ابن عاصم کوفی" اس نام کی کوئی کتاب مجھے معلوم نہیں ۔ بظاہر اس سے اعثم کوفی کی تاریخ مراد ہے ۔ لیکن اعثم کوفی ایک ایسا خوش قسمت انسان ہے جس کے حوالے شیعوں کی کتابوں میں سنی کہہ کر درج ہیں اور برمی صاحب اُس کو شیعہ کہکر حوالہ دے رہے ہیں ۔ حقیقت میں ایسے مجہول مؤلف کی کتاب نہ اُن کے لئے سند ہو سکتی ہے نہ اِن کے لئے ۔

اُس کی شخصیت ہی کا آج تک پتہ نہیں چلا کہ وہ تھا کون اور کس زمانہ میں اور کس پایہ کا شخص تھا ۔

(۲) "شرح نہج البلاغہ مطبوعہ طہران" اس کے لئے ضرورت تھی یہ لکھا جانا کہ کون سی شرح اس لئے کہ نہج البلاغہ کی متعدد شرحیں چھپی ہیں جن میں سے بعض سنیوں کی ہیں اور بعض شیعوں کی ہیں ۔ پھر کیا معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ مضمون کس شرح میں درج ہے ۔

(۳) "انوار الحمایت" از یحیی بن حمزہ شیعہ زیدی ۔ یہیں اپنے

معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس نام کی کوئی کتاب شیعی مؤلفات میں موجود نہیں ہے۔ "یحیی بن حمزہ" بھی شیعی مؤلفین میں کوئی نہیں ہیں۔

(۴) فصول امامیہ۔ اس کتاب کا بھی وجود کہیں نہیں ہے۔
"فصول مہمہ" ایک کتاب ہے مگر وہ ابن صباغ مالکی کی ہے۔ جو علمائے اہل سنت میں سے تھے۔

تفسیر قمی کا ایک حوالہ درست دیا گیا ہے مگر دیکھئے تو اُس میں ہے کیا؟ یہ کہ جناب ابو بکر نے حضرت رسول اللہ کے اخبار بالغیب پر شک کا اظہار کیا جس پر حضرت نے معجزہ دکھلایا تو آپ نے کہا کہ یا رسول اللہ آپ بے شک سچے ہیں۔ اس سے تو حضرت ابو بکر کے ایمان بالرسول کی بڑی کمزوری ظاہر ہوتی ہے نہ یہ کہ کوئی فضیلت پیدا ہوتی ہو۔

کیا ایسے ہی حوالوں کے ساتھ اُن روایات کا معارضہ کیا جاسکتا ہے جو شیعوں کی جانب سے کتب اہل سنت میں سے پیش کی جاتی ہیں جنکے لکھنے والے مسلم الثبوت حفاظ و محدثین اور ائمہ تفسیر و مؤرخین ہیں اور جن کی شخصیت ناقابل انکار ہے۔

چھٹی تنقیح

سنی شیعہ اختلاف میں سیاسی اغراض کی کارفرمائی

افسوس ہو کہ سنی شیعہ اختلاف کے سلسلہ میں مذہب شیعہ پہ یہ ذمہ داری عائد کی جاتی ہے کہ وہ سیاسی اغراض کے ماتحت عالم وجود میں آیا ہے حالانکہ جہاں تک غور کیا جاتا ہے شیعہ مذہب تو صرف آیات واحادیث پر مبنی ہے لیکن سنّی مسلک صرف دنیاوی ڈپلومیسی سے دنیا میں قائم ہوا یہ عجیب بات ہے کہ جس مذہب نے اپنا سنگ بنیاد ہی خدا اور رسول سے الگ کر کے قائم کیا ہو۔ جس مذہب نے پیشوائی کا کوئی معیار ہی قرار نہ دیا ہو بلکہ جیسا رنگ زمانہ کا دیکھا ہو ویسا ہی اصول بنا لیا ہو۔ اس لئے اجماع اور اس کے بعد استخلاف اور پھر شوری آخر میں قہر و غلبہ اصول اساسی میں قرار دیا گیا ہو۔

جس مذہب میں بادشاہان دنیا کو اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم کے ماتحت خدا اور رسول کا ہم پلہ قرار دے لیا جائے وہ تو سیاسی اغراض کا نتیجہ نہ ہو اور جس مذہب میں سوائے قال اللہ و قال الرسول کے کچھ اور بات ہی نہ مانی جاتی ہو۔ جہاں مال و دولت سے کنارہ کشی کی گئی ہو اور ظاہری شان و شوکت کو کوئی چیز نہ سمجھا گیا ہو وہ سیاسیات کا نتیجہ قرار پائے۔

"بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است"

بنی امیہ کے زمانہ میں کس طرح احادیث وضع کئے جاتے تھے کس طرح

وضع احادیث پر انعامات دیئے جاتے تھے، کس طرح حضرت علی کے فضائل و کمالات پر پردہ ڈالا جاتا تھا اور کس طرح دنیا کو اہلبیت سے ناواقف بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہ بہت مبسوط باب ہے جس کے لئے اب نہ وقت میں وسعت ہے، نہ قلم کو لکھنے کا حوصلہ باقی ہے۔

ساتویں تنقیح

کیا نفرت و عناد کی اسپرٹ شیعی مذہب کی وہ خصوصیت ہے جو اس کے اصلاحی یا الہامی ہونے کے خلاف ہے؟

یہ وہ اعتراض ہے جو شیعہ فرقہ پر عام طور پر کیا جاتا ہے۔ اسی بزمی صاحب نے بھی بڑی اہمیت دیکر پیش کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ محبت و ہمدردی ہر اصلاحی مذہب کا بنیادی اصول ہے ـــــ لیکن دنیا میں یہ امتیاز صرف شیعہ مذہب ہی کو حاصل ہے کہ اس کی بنیاد محبت و اخوت کے بجائے نفرت و عناد کے جذبات پر قائم کی گئی ہے۔"

چونکہ اس بحث میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مبسوط اور پرزور مقالہ

لکھا ہے جو اپنے دلائل کے لحاظ سے اس بحث میں ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے اس لئے اُس مقالہ کو یہاں درج کیا جاتا ہے اور یہی اس تبصرہ کا آخری جزو ہے۔

تولا و تبرّا

(از مولانا ابوالکلام آزاد مدظلّہ)

سچ یہ ہے کہ پل صراط کی راہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اور اس کے نیچے آتش جہنم کے شعلے بھڑک رہے ہیں لیکن اُس کا سامنا صرف قیامت پر ہی کیوں اُٹھا رکھا جائے الدنیا مزرعۃ الاخرۃ آج دنیا کے سفر میں بھی پل صراط ہر شخص کے سامنے ہے۔

یہ پل صراط درحقیقت اخلاق کی دشوار گزار راہ ہے جذبات و امیال انسانی کے اعتدال کا لاینحل مسئلہ ہی پل صراط ہے بال سے زیادہ باریک تلوار کی دھار سے زیادہ تیز اور اُس کے نیچے ہلاکت و بربادی کا قصر آدم کی اولاد میں سے کوئی نہیں جس کو اُس پر ایک بار نہ گزرتا ہو وان منکم الا واردھا کان علیٰ ربک حتما

مقضیا" تم میں سے کوئی نہیں جو اس پر سے نہ گذرے یہ ایک وعدہ اور فیصلہ ہے جس کو خدا نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ ۲۰۹، ۷

اخلاق کے سینکڑوں مشکل مسائل میں سے ایک مشکل تر مگر اصولی مسئلہ بغض و حسد، تولّا و تبرا، تحسین و تذلیل، اور عفو و انتقام کا بھی ہے۔ ایک طرف اخلاق ہم کو تلقین کرتا ہے کہ دل کو محبت کے لئے مخصوص کر دو کہ اس گھر کے لئے یہی قانون موزوں ہے۔ انیس سو برس پہلے کا ایک اسرائیلی واعظ کہتا ہے کہ دشمنوں کو بھی پیار کرو کیونکہ اگر صرف چاہنے والوں کو چاہا تو تمھارے لئے کیا اجر۔[19]

اخلاق کے اولین اور سامنے کے سبق یہی ہیں کہ پیار کرو خاکسار بنو کسی سے بغض نہ رکھو، سب کی عزت کرو انسان کی انسانیت کا بغیر تفریق ادب کرو اور جس کو سامنے دیکھو سر جھکا دو۔ سوسائٹی نے بھی صدیوں سے ان تعلیموں کو اعتقاداً قبول کر لیا ہے اور اصطلاحی اخلاق، مروت، پاس و لحاظ، شرم و حیا، شرافت و انسانیت تمام الفاظ ان ہی معنوں میں بولے جاتے ہیں۔

لیکن اس کے مقابلہ میں اسی اخلاق کا ایک دوسرا پارٹ ہے جہاں آکر اس کی یہ غریب و مسکین صورت ایک سخت اور جابرانہ خشونت سے مبدل ہو جاتی ہے اور دنیا میں اگر اس کی صدا پہلی تعلیم دیتی ہے تو خود

اُس کا عمل دوسری شکل میں سامنے آتا ہے وہ چور کو قید کرتا ہی اتنی ہی بدی کو برا بھی کہتا ہی زید کو کہتا ہے کہ وہ نیک ہے اس لیئے اچھا ہے عمر کو کہتا ہے کہ تم بداعمال ہو اس لئے برے ہو۔ ظالم سے اُس کے ظلم کا اور مجرم سے اُس کے جرم کا مطالبہ کرتا ہے ۔پہلی حالت میں جس قدر عاجز تھا اتنا ہی اُس حالت میں مغرور و متکبر ہو جاتا ہے پہلے اگر عاجزوں کے جھکے ہوئے سروں کو اُٹھا کر اپنے سینہ پر جگہ دیتا تھا تو اب سرکشوں کے سروں کو اپنی ٹھوکروں سے پامال کرتا ہے اور پھر ساتھ ہی حالت یہ ہے کہ اُس کی پہلی تعلیم سے اگر صرف معبدوں اور خانقاہوں میں رونق پیدا ہوتی تھی تو اس عمل سے پوری دنیا میں انتظام اور قانون قائم ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں اصول کے لئے ایک سخت تصادم اور کشمکش پیدا ہو جاتی ہے اور فیصلہ ہکا بکا رہ جاتا ہے سوال یہ ہے کہ ان متضاد حالات میں راہ تطبیق کیا ہے۔ عفو و درگذر کے اصول سے کام لیجئے تو دنیا سے نیکی و بدی کی تمیز اُٹھ جاتی ہے ۔انتظام و پاداش کی راہ اختیار کیجئے تو دنیا سے رحم و محبت نابود ہو جاتی ہے سب کو اچھا کہئے تو صرف اچھوں کے لئے آپ کے پاس ہے برائی کیجئے تو اُس کے حدود داور فیصلہ کن اصول کیا ہیں۔

آج ملک میں جو طبقہ شخصی حکومت کے جرائم سے مریض ہو رہا ہے وہ گو خود جاں بلب ہے مگر اُس کی نظر اپنے مرض پر نہیں بلکہ دوسروں کی شکایتوں پر ہے غلامی کے حلقوں کے لئے سب کے کان چھیدے ہوئے ہیں، پاؤں برسوں سے بوجھل بیڑیوں کے عادی ہو گئے ہیں ان حلقوں اور بیڑیوں کے لئے ضرور نہیں کہ وہ تخت و تاج ہی کی طرف سے بخشے گئے ہوں بلکہ ہر چاندی کا ڈھیر، ہر قیمتی کپڑا، ہر قیمتی موٹر، ہر ہوٹل کی اعلیٰ ترین منزل کا مقیم اور ہر وہ مدعی جن کے گلے میں طاقت اور جیب میں سکے ہوں ایک قانونی اور موروثی حق رکھتا ہے کہ جس کو چاہے اپنے حلقۂ غلامی کے انتساب کا فخر دیدے۔

رسول عربی کے وقت تین سو ساٹھ بت تھے جس سے بیت خلیل کی دیواریں چھپ گئی تھیں لیکن آج اُس کی اُمت میں ہر چکیلی ہستی لات و منات کی قائم مقام ہے اور ہر حاکم ہر رئیس، ہر حکام میں اور سب سے آخر مگر سب سے پہلے ہر خوش لباس لیڈر ایک بت کا حکم رکھتا ہے۔ پوری ملت موحدہ اُن کی پوجا اور پرستش میں مشغول ہے اور بعینہ اس پرستش کا وہی جواب رکھتی ہے جو قریش مکہ کے پاس تھا کہ ما نعبدهم الا ليقربونا الى الله زلفى - ۳۸ : ۲

ويعبدون من دون الله ما لا ينفعهم شيئا ولا يضرهم ويقولون

هؤلاء شفعاؤنا ۔

اس انسان پرستی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ بالعموم طبیعتیں مدح وتحسین کی عادی ہوگئی ہیں، نکتہ چینی اور نقد واعتراض کی متحمل نہیں ہوسکتیں ہر شخص مخاطب سے اگر کوئی قدرتی امید رکھتا ہے تو وہ یہی ہوتی ہے کہ مدح ومنقبت کا ترانہ سنائے اور بادۂ تحسین وآفرین کی پے در پے بخشش سے ساقی کا ہاتھ کبھی نہ تھکے ۔

شرکت وبت پرستی کے اس عام سکون میں اگر کوئی صدائے توحید غلغل انداز ہوتی ہے تو ہر طرف سے اپنے ایک قدیم پیشرو کی طرح لئن اتخذت الٰہا غیری لاجعلنک من المسجونین ۔

"اگر میرے سوا کسی دوسری ذات کو تو نے اپنا معبود بنایا تو میں تجھ کو قید کر دوں گا"۔ ۲۶ : ۲۹ کا غل مچ جاتا ہے اور صرف یہ معبودان باطل ہی نہیں بلکہ اُن کے پرستار بھی چاروں طرف سے ٹوٹ پڑتے ہیں ۔

یہ ایک قدیم سنت ہے اور دنیا میں جب کبھی بھی سچائی آتی ہے تو اُس کو ہمیشہ ایسے ہی لوگوں سے مقابل ہونا پڑا ہے ۔

فما کان جواب قومہ الا ان قالوا احرقوہ وانصروا الھتکم ان کنتم فاعلین ۲۱ : ۱۸

ایسے موقعوں پر عموماً اخلاقی مواعظ سے کام لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ

بڑے آدمیوں پر حملہ کرنا انسانیت اور تہذیب کے خلاف ہے۔ گالیاں دینا کوئی عادت نہیں۔ اختلاف رائے ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔

یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ مخالف آرا رکھنے والوں کی تذلیل وتحقیر کی جائے پھر اگر ایسا کرنے کے لئے آپ مجبور ہیں تو ذرا لہجہ نرم کیجئے اور شکایت بھی کیجئے تو شکر کے لہجے میں کیجئے محبت ونرمی سے کام نکلے تو سختی دکھلانا شان شرافت نہیں۔

آج کل بھی کہ ہشیاری اور بیداری کی نہیں تو خمار وسرشاری کی ایک کروٹ تو مسلمانوں نے ضرور بدلی ہے۔ نکتہ چینیوں کی زبانوں کو ایسے ہی ظاہر فریب در اخلاقی جملوں سے بند کیا جا رہا ہے۔

پس ہم چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے اصولاً اس مسئلہ پر غور کریں کہ فی الحقیقت اس بارے میں کوئی فیصلہ ہمارے پاس ہے یا نہیں۔

کسی کو برا کہنا یقیناً اچھی بات نہیں دل محبت کے لئے ہے نہ کہ عداوت کے لئے لیکن کیا ایسی صورتیں بھی ہیں جن میں یہ برائی ہی سب سے بڑی نیکی اور بھلائی ہو جاسکتی ہے۔

سب سے پہلے اسے اخلاق کے علم اصول کے لحاظ سے دیکھئے جب بھی فیصلہ صاف ہے دنیا میں جس دن اخلاق بنا کہ نیکی کو نیک اور نیک عمل کو اچھا کہو کیونکہ بغیر اس کے دنیا میں نیکی زندہ نہیں رہ سکتی

اسی وقت سے اُس نے ضمناً یہ بھی کہہ دیا کہ نیکی کی خاطر بدی کو برا اور بدعمل کو قابل نفرت سمجھو کیونکہ نیکی کو اُس کا حق تحسین مل نہیں سکتا جب تک بدی کو اُس کی سرزنش اور نفرت نہ مل جائے۔

زیادہ غور کیجئے تو یہ ایک قدرتی اور عام معمولی سی بات ہے کہ گو اُس کا آپ کو حس نہ ہو دنیا میں اخلاق محاسن و فضائل کا اگر کوئی وجود ہے تو صرف اُن کے اضداد کے تقابل ہی کا نتیجہ ہے۔ جب تک رذائل انسانی کو نمایاں نہ کیجئے گا فضائل انسانی وجود پذیر نہ ہونگے۔

اس کے لئے روشنی اور تاریکی کی مثال شائد مقصد میں معین ہو کہ روشنی کا وجود صرف تاریکی کے وجود ہی کا نتیجہ ہے۔ رہا اخلاقی تلقینات اور اعمال کا اختلاف تو یہ تو اخلاق کے ہر مسئلہ میں درپیش ہے مگر درحقیقت دونوں صورتوں میں کوئی تضاد نہیں اخلاق دنیا میں کسی شئے کو فی نفسہ اچھا یا بُرا کہنے کا فیصلہ نہیں کر سکا اس کی ہر تعلیم نسبت و اضافت سے وابستہ ہے اور اُس کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی رہی ہے کوئی شئے اُس کے آگے نہ تو اچھی ہے اور نہ بُری ایک ہی چیز کا بعض حالتوں میں نام نیکی ہوتا ہے اور بعض حالتوں میں بدی یہی حاصل اس مسئلہ کا بھی عفو درگزر، آشتی و محبت، نرمی و عاجزی انسان کے لئے سب سے بڑی نیکی ہیں۔ لیکن کن کے سامنے؟ عاجزوں

اور درماندوں کے سامنے نہ کہ ظالموں اور مجرموں کے آگے ۔ ایک مسکین اور فلاکت زدہ سے بے رحم کیجئے تو سب سے بڑی نیکی اور ایک ظالم پہ کیجئے تو سب سے بڑی بدی ہے ۔ گرے ہوؤں کو اُٹھائیے تاکہ وہ چل سکیں لیکن اگر سرکشوں کو ٹھوکر نہ لگائیے گا تو وہ گرے ہوؤں کو اور گرا دیں گے ۔ قانون کو دیکھئے تو وہ جرم کو روکنے کے لئے خود جرم کرتا ہے ۔ خونریزی انسان کے سامنے سب سے بڑی معصیت ہے ۔ لیکن خونریزی کو روکنے کے لئے وہ قاتلوں کے خون بہانے ہی ہیں امن دیکھتا ہے قاتل کا قتل بدی تھا لیکن عدالت کا فتویٰ قتل نیکی ہو گیا ۔

ہم نے بغیر کسی ترتیب کے چند جملے پھیلا دئیے کیونکہ یہ اخلاق کے ایسے عام اعمال ہیں جن کو یاد دلا دینا ہی کافی ہے پس جو لوگ کہتے ہیں کہ ہر انسان اخلاقاً نرمی و آشتی و محبت و عفو کا مستحق ہے اور کسی کا برائی کے ساتھ ذکر کرنا اخلاق کے اصول کے خلاف ہے وہ اخلاق کے نام سے ایسی سخت بداخلاقی کی تعلیم دینا چاہتے ہیں جس پر اگر ایک لمحہ کے لئے بھی عمل کیا جائے گا تو دنیا شیطان کا تختگاہ بن جائیگی نیکی اور اعمال صالحہ کا نظام درہم و برہم ہو جائیگا ۔ قانون اخلاق، مذہب، حسن و قبح کی تمیز، اور نور و ظلمت کی تفریق کوئی بھی خدا کو خوش کرنے والی چیز دنیا میں باقی نہ رہے ۔

یاد رکھو کہ ہر محبت کے لئے ایک بغض لازمی ہے اور کوئی عاجزی نہیں کر سکتا جب تک کہ متکبر اور مغرور نہ ہو نیکی کو اگر پسند کرو گے تو اُس کی خاطر بدی کو بُرا کہنا ہی پڑیگا اور خدا کو خوش رکھنا ہو تو شیطان کی دشمنی کی پروا مت کرو۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ اُس کے لئے فیصلہ کن حدود معین ہونے چاہئیں نرمی و رحم اور عفو و درگذر کے مقامات کیا کیا ہیں اور سخت گیری پاداش اور انتقام کا حق کس موقع پر حاصل ہوتا ہے

عام اخلاق کے اصول بھی ان سوالوں کا جواب شائد دے سکتے ہیں مگر ہم تو دنیا کی ہر شئے کو مذہب ہی میں ڈھونڈھتے ہیں پھر اس کے بعد نہیں جانتے کہ دنیا میں اور کیا کیا جاتا ہے۔

ہمارے ہاتھ میں قرآن کریم ایک امام مبین، تبیانا لکل شیئی، بیان للناس، نور و کتاب مبین اور انسان کے ہر اختلاف و نزاع کے لئے ایک حاکم ناطق ہے اور پھر اُس کا عملی نمونہ اور وجود ظلی اس کے حامل اور مبین کی زندگی کے اعمال ہیں کہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ پس ان سوالوں کا جواب بھی وہیں ڈھونڈھنا چاہئے۔

اسلام نے اپنی تعلیم دعوت اور اپنی امت کے قیام و بقا

کے لئے اساس اولین اور نظام ہنیادی ایک اصول کو قرار دیا ہے اور اس کو وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تعبیر کرتا ہے۔

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر واولئک ھم المفلحون۔ ۳:۱۰۴

"تم میں ایک جماعت ہونی چاہیئے جو دنیا کو نیکی کی دعوت دے بھلائی کا حکم کرے اور برائی سے روکے وہ ہی فلاح یافتہ ہیں"۔

اس آیت میں اللہ تعالی نے دعوت الی الخیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بطور ایک اصول کے پیش کیا ہے اور مسلمانوں میں سے ایک گروہ کا اس کو فرض قرار دیا ہے لیکن اس رکوع میں آگے چل کر دوسری آیت ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ ۱۱۰

"تمام امتوں میں تم سب سے بہتر امت ہو کہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔

ایک تیسری آیت میں مسلمانوں کا یہ عملی امتیاز اور قومی فرض زیادہ نمایاں طور پر بتلایا ہے۔

وکذلک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس و

یکون الرسول علیکم شہیدا ۲ : ۱۴۳

"اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی اور وسط کی امت بنایا تاکہ اور لوگوں کے مقابلہ میں تم گواہ بنو اور تمہارے مقابلہ میں تمہارا رسول گواہ ہے۔

الامر بالمعروف والنہی عن المنکر

اسلام نے اپنی تعلیم و دعوت اور اپنی امت کے قیام و بقا کے لئے اساس اولین اور نظام بنیادی ایک اصول قرار دیا ہے اور اس کو وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے تعبیر کرتا ہے۔

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویأمرون بالمعروف وینہون عن المنکر اولئک ہم المفلحون ۔ ۳ : ۱۰۴

"تم میں سے ایک جماعت ہونی چاہیئے جو دنیا کو نیکی کی تعلیم دے بھلائی کا حکم کرے اور برائی سے روکے وہی فلاح یافتہ ہیں"۔

اس آیت میں خدائے تعالیٰ نے دعوت الی الخیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بطور ایک اصول کے پیش کیا ہے۔ اور بظاہر مسلمانوں میں سے ایک گروہ خاص کو اس کا فرض قرار دیا ہے لیکن اس کو عام میں آگے چل کر ایک دوسری آیت ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنہون عن المنکر

وتومنون باللہ ۳: ۱۰۶

"تمام امتوں میں تم سب سے بہتر امت ہو کہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

ایک تیسری آیت میں مسلمانوں کا یہ ملی امتیاز اور قومی فرض زیادہ نمایاں طور پر بتلایا گیا ہے۔

کذلک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا ۲: ۱۲۷

"اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی اور وسط کی امت بنایا تاکہ لوگوں کے مقابلہ میں تم گواہ بنو اور تمھارے مقابلہ میں تمھارا رسول گواہ ہو۔"

تفسیر آیات :-

ان تینوں آیتوں میں خدا تعالیٰ نے خاص طور پر مسلمانوں کا اصلی مشن، مقصد تخلیق، قومی امتیاز اور شرف خصوصی ایسی چیز کو قرار دیا ہے کہ گو دنیا میں اعلان حق ہر برگزیدہ ہستی اور جماعت کا فرض رہا ہو مگر مسلمانوں کا تو سرمایۂ زندگی یہی فرض ہے وہ دنیا میں اس لئے کھڑے کئے گئے ہیں کہ خیر کی طرف داعی ہوتے ہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی کو جہاں کہیں دیکھتے ہیں اپنے تئیں اس کا ذمہ دار سمجھکر روکتے ہیں۔ آخری آیت میں کہا کہ تم کو ایک وسطی امت بنایا گیا تاکہ تم اولین و آخرین

سکے لئے گواہ بن سکو اور اس امر کی کہ تم نے اپنا فرض ادا کیا یا نہیں تمہارا رسول امین اللہ کے آگے گواہ ہو۔ اخلاق کے تمام دفتر کا تعین قرآن کے اسی اصل اصول پر قائم ہے۔

گو تفصیل کا موقع نہیں مگر ان آیات کے متعلق چند تفسیری اشارات کردینا فہم مقصد میں معین ہوگا۔

امر بالمعروف حکم عام ہے

دوسری آیت میں اس لئے المعروف اور المنکر پر الف لام استغراق کے لئے آیا تاکہ بقول امام رازی معروف اور منکر میں کوئی تخصیص و تحدید باقی نہ رہے اور ظاہر ہو جائے کہ وہ ہر نیکی کے لئے آمر اور ہر بدی کے ناہی ہیں۔ عام اس سے کہ وہ کہیں پر اور کسی صورت میں ہو۔ وھذا یقتضی کونھم اٰمرین لکل معروف وناھین عن کل منکر۔ تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۲۲۵۔

مسلمانوں کے ملی شرف و فضیلت کی علت:۔

خیر امۃ اخرجت للناس کے بعد امر بالمعروف کا ذکر کیا اور یہ اس لئے کہ پہلے وصف بیان کرکے پھر اس کی علت بیان کی جائے۔ یعنی مسلمانوں کا بہترین امت سے ہونا صرف اُن کے وصف پر منحصر ہے کہ وہ آمر بالمعروف وناہی عن المنکر ہیں خیر کی دعوت دیتے ہیں اور

شر سے روکتے ہیں۔

کما قال تعالیٰ یعلم الناس و یکسوھم۔ اور یہیں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر یہ وصف امتیازی ان سے جاتا رہے تو پھر وہ بہترین امت ہونے کے شرف سے بھی محروم ہو جائیں اور اُن کا وہی قومی امتیاز ان میں باقی نہ رہے۔

تیسری آیت کی تفسیر:۔

تیسری آیت میں اُن کو وسط کی امت قرار دیا اور پھر اس کا سبب یہ بیان کیا گیا کہ "تاکہ تم لوگوں کے لئے گواہ ہو۔ افسوس ہے کہ اس صاف اور سلجھی ہوئی بات میں بھی ہمارے بعض مفسرین نے لاحاصل بحثیں پیدا کر دیں اور اس بحث میں پڑ گئے کہ یہ شہادت دنیا میں ہوگی یا آخرت میں۔ اسلام کا اصلی کارنامہ غیر فانی دنیا ہی کی اصلاح تھا۔ مگر مفسرین اس کی طرف سے اس درجہ غافل ہیں کہ ہر شے کو آخرت ہی پر اُٹھا رکھنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر اسی شہادت کا حضرت عیسیٰؑ کی زبانی ذکر کیا گیا ہے کہ کنت علیہم شہیدا ما دمت فیہم "میں اپنی امت پر شاہد تھا جب تک کہ اُن میں موجود تھا۔"

اور ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ اپنی امت میں دنیا کے اندر ہی موجود تھے نہ کہ آخرت میں۔ پس یہاں بھی شہادت سے وہی شہادت مراد ہے جو دنیا کی زندگی میں انجام دی جاسکتی ہے۔ تاہم علامہ رازی کا ہمیشہ

ممنون ہونا پڑتا ہے کہ وہ گو ہر آیت کے متعلق طرح طرح کی توجیہات
جمع کر دیتے ہیں مگر پھر بھی ایک نہ ایک ایسی توجیہہ ضرور اُن میں موجود ہوتی
ہے جو اصل حقیقت سے پردہ اٹھا دیتی ہے اور وہی خود اُن کی ذاتی رائے
ہوتی ہے۔ اس آیت کے متعلق بھی اُنھوں نے دوسرے قول کو بیان
کرتے ہوئے جو کچھ لکھدیا ہے وہ بالکل صاف اور غیر پیچیدہ ہے۔ ج ۱ ص ۱۴۳

امتہ وسطا:۔

اصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مسلمانوں
کا فرض منصبی قرار دیا اور فی الحقیقت ایسا کرنا دنیا میں عدل حقیقی
کو قائم کرنا تھا۔ برائی اگر روک دی جائے اور نیکی کو رائج کیا جائے
تو دنیا کے نظم کے قوام کا اس کے علاوہ اور کیا اعتدال ہو سکتا ہے عدل
کے معنی ہیں عدم افراط و تفریط کے یعنی کسی شے کا نہ زیادہ ہونا اور
نہ کم ہونا۔ اور درجہ مقام (وسط) اور درمیانی ہے۔

گناہ کی حقیقت اور اصطلاح قرآنی میں "اسراف"۔

دنیا میں جس قدر برائیاں ہیں غور کیجئے تو وہ افراط یا تفریط کے سوا
اور کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ انسان کے تحفظ خود امتیازی اور حفظ
حقوق کے لئے غیبت غضب اور ہیجان کا ہونا ضروری تھا۔ لیکن
جب یہ جذبات اپنی حد سے آگے قدم بڑھاتے ہیں تو فطرت کی بخشی ہوئی

ایک شئے جو یقیناً نیکی تھی بجائے ایک بدی بن جاتی ہے اور اُن کا نام جرم اور گناہ بن جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنی اصطلاح میں ہر جگہ معصیت اور گناہ کے لئے اسراف کا لفظ اختیار کیا۔

یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمة اللہ " اے وہ میرے بندو کہ تم نے اپنے نفسوں پر اسراف کیا ہے رحمت الٰہی سے مایوس نہ ہو۔

یہاں مسرفین سے مراد سخت درجہ کے گناہگار اور معصیت شعار انسان ہیں۔ کیونکہ آیت کا شان نزول نیز آگے چل کر ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا کہنا اس کی پوری طرح تشریح کر دیتا ہے اسراف کی تعریف صرف الشیئ فیما ینبغی زائدا علی ما ینبغی اور تجاوز الحد فی کل شیئ کا اغب ہے۔

یعنی کسی چیز کو اُس کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اور ہر شے کا اپنی حد سے تجاوز کر جانا۔

اس سے بڑھ کر گناہ کی تعریف کیا ہو سکتی تھی کہ وہ قوتوں اور خواہشوں کے بے اعتدالانہ خرچ کا نام ہے۔

اسراف کے علاوہ اصطلاح قرآنی میں ایک لفظ تبذیر بھی ہے جیسا کہ فرمایا ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین۔

"بے موقع اور بے ضرورت مال و دولت کو ضائع کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں"۔ لیکن تبذیر اور اسراف میں ایک باریک فرق یہ ہے کسی شے کے خرچ کرانے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں بعض چیزیں خرچ تو کی جاتی ہیں اُن کے ٹھیک ٹھیک مصرف میں لیکن تعداد صرف ضرورت اور حد معینہ سے زائد ہوتی ہے اور طریق صرف صحیح نہیں ہوتا مثلاً ایک مجرم پر اُس کے قصور سے زیادہ غضبناک ہونا اور مناسب سزا دینے کی جگہ مار پیٹ سے کام لینا۔ بے شک ایک مجرم کو اُس کے جرم کی پاداش ملنی چاہیئے اور اسی لحاظ سے آپ کے غصہ کا خرچ صحیح مصرف میں ہوا لیکن جس مقدار اور جس صورت میں غصے کو آپ خرچ کر رہے ہیں یہ اُس کے حدود اور اُس کی ضرورت سے زیادہ ہے اور اسی کا نام اسراف ہے۔ برخلاف تبذیر کے کہ اُس کی تعریف صرف الشیئ فیما ینبغی بیان کی گئی ہے یعنی کسی چیز کو اُس کے مصرف کے علاوہ دوسری جگہ خرچ کرنا مثلاً دولت نفس کے ضروری آرام و آسائش اعزا و اقربا کی اعانت اور اعمال حسنہ میں خرچ کرنے کے لئے ہے۔ مگر آپ اُسے محض اپنی جاہ و نمائش دنیوی عزت اور حکام کی نظروں میں رسوخ حاصل کرنے کے لئے باسمائے مختلفہ لٹانا شروع کر دیں تو صرف قرآن کریم

اس کو تبذیر سے تعبیر کریگا اور چونکہ اس میں نقصان اسراف سے شدید تر ہے۔ اس لئے وعید بھی سخت وارد ہوئی مُسرف کے لئے تو صرف ان اللہ لا یحب المسرفین "خدا اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا" فرمایا اور مبذرین کے مرتکبین کو کانوا اخوان الشیاطین۔ کہہ کر شیطان کے اخوان واقارب میں شمار کیا گیا۔ اسراف اور تبذیر کا یہ فرق خود قرآن کریم سے ماخوذ ہے تفسیر بالرائے نہیں ہے۔ یہ دونوں لفظ جہاں جہاں بولے گئے ہیں اگر اُن کا استقصا کیا جائے تو خودبخود یہ فرق ظاہر ہو جائیگا مثلاً کلوا واشربوا ولاتسرفوا ان اللہ لا یحب المسرفین "کھاؤ اور پیو مگر اسراف نہ کرو اللہ اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا"

بھوک اور پیاس میں غذا اور پانی کا صرف ایک بالکل صحیح مصرف کا خرچ ہے اور اشیاء کا بے موقع خرچ کرنا نہیں ہے غذا کھانے ہی کے لئے ہے اور پانی پینے ہی کے لئے لیکن اگر حد خواہش اور ضرورت سے زیادہ کھایا جائے تو یہ اسراف ہو جائیگا۔ اسی لئے فرمایا کہ اسراف مت کرو۔ لیکن ایک دوسرے موقع میں صورت خرچ اشیاء اس سے مختلف تھی

وآت ذی القربیٰ حقہ والمسکین وابن السبیل ولاتبذر تبذیرا۔

"اور اقارب کا حق اُن کو دو نیز مسکین اور مسافر کے حقوق ادا کرو اور دولت کو بے جا ضائع مت کرو۔"

یہاں چونکہ مقصود یہ تھا کہ دولت کا مصرف صحیح اعزا و اقارب وغیرہ کے حقوق ادا کرنا ہے پس دوسرے کاموں میں اس کو بے موقع خرچ مت کرو اس لئے اسراف نہیں کہا بلکہ تبذیر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔

رجوع الی المقصود

حاصل سخن یہ ہے کہ گناہ، معصیت، فسق، جرم اور ہر وہ شے جس کا شمار برائیوں اور بدیوں میں ہے فی الحقیقت بے اعتنائی اور افراط و تفریط ہی کا نام ہے۔ اس کے مقابلہ میں نیکی اور خیر کو صرف ایک ہی لفظ عدل سے تعبیر کیجئے کہ ہر وہ شئے جس میں عدل پایا جائے۔ یقیناً نیکی اور عمل خیر ہے قرآن ہر جگہ ہر طرح کے محاسن و فضائل کو ایسی جامع اور مانع لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کی اصطلاح میں صراط المستقیم توازن قسط۔ میزان الموازین قسطاس المستقیم اور عدم تطفف اور اسی طرح کی بیسیوں الفاظ اسی ایک مقام عدل سے عبارت ہیں اور تعلیم ہیں لا تعتدوا زیادتی مت کرو اور اعدلوا عدل کرو کے اصول کی دعوت دیتا ہے اور اسی راہ عدل کو اقرب الی التقوی بتلاتا ہے۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ ہر شئے میں خواہ وہ اُس کی عبادت اور بندگی اور خواہ اُس کی

راہ میں خیرات اور بخشش ہی کیوں نہ ہو یہ ہے۔

ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطھا کل البسط فتقعد ملوما محسورا۔ ۱۷:۲۹۔

"اور اپنا ہاتھ تو اس قدر سکیڑ و کہ گویا گردن میں بندھ گیا ہے اور نہ بالکل پھیلا ہی دو۔ ورنہ تم خالی ہاتھ بیٹھے رہ جاؤ گے اور لوگ تم کو ملامت کریں گے"۔

ہر کام کے لئے اس آیت میں اعتدال کی ایک جامع مثال بیان کر دی گئی ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مقصود قیام عدل ہے۔ پس جیسا کہ ہم نے ابتدا میں اس طرف اشارہ کیا تھا جس جماعت کا فرض دعوت الی الخیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو گا وہ دنیا میں ایک ایسی طاقت ہو گی جو صرف نیکی ہی کی خاطر دنیا میں بھیجی گئی ہے۔ اور چونکہ نیکی عبارت ہے عدل سے اور بدی اُس کے عدم سے اس لئے فی الحقیقت وہ عدل کو قائم رکھنے والی اور ہر افراط اور تفریط کو کہ بدی اور گناہ ہے روکنے والی جماعت ہو گی۔

اب عدل کی حقیقت پر غور کیجئے تو وہ فی الحقیقت ہر شے کے واسطہ اور درمیانی حالت کا نام ہے جسے کسی ایک طرف جھک پڑے تو یہ افراط اور

تفریط ہے لیکن ٹھیک ٹھیک درمیان میں اس طرح کھڑے رہئے کہ بال برابر جگہ بھی کسی طرف زیادہ نہ بچی ہو تو اس کا نام اعتدال ہو گا۔ قرآن مجید نے اس کی نہایت عمدہ مثال دی ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے:۔

وزنوا بالقسطاس المستقیم ذلک خیر و احسن تاویلا۔ ۱۷: ۳۷۔

"جب کسی چیز کو تولو تو ترازو کی ڈنڈی سیدھی رکھو تاکہ وزن میں دھوکا نہ ہو یہ طریق خیر اور نیک انجام ہے"

دوسری جگہ ایک سورت اس جملہ سے شروع کی ہے:۔

ویل للمطففین ۸۳: ۱ "ناپ تول میں کم کر دینے والوں کے لئے بڑی تباہی ہے"

عدل کے لئے سب سے زیادہ مشاہدہ میں آنے والی اور عام فہم مثال ترازو کی تھی کہ اس کے تمام اعمال کی صحت کا دارومدار محض اس کے اوپر کی سوئی پر ہے۔ جب تک وہ ٹھیک ٹھیک اپنے وسط میں قائم نہ ہو جائے وزن کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ جوں ہی دونوں پلوں کا وزن مساوی ہو گا معاً سوئی بھی وسط میں آکر ٹھہر جائیگی۔

اسی لئے قرآن نے اکثر مقامات میں ترازو کی مثال سے کام لیا ہے اور قیامت کے دن بھی انسانی اعمال کا فیصلہ اسی کے ہاتھ ہو گا۔

فاما من ثقلت موازینہ فھو فی عیشۃ راضیۃ واما من خفت

موازینہ فامہ ھاویۃ - یہی سبب ہے کہ وسط کو عدل کے معنوں میں بولا جاتا ہے - اور فی الحقیقت وکذلک جعلناکم امۃ وسطا میں بھی وسط سے مراد عدل ہی ہے -

جس جماعت کا فرض امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو اس سے بڑھ کر اور کون سی جماعت عنداللہ اور عندالناس عادل ہو سکتی ہے پس خدائے تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تم کو تمام دنیا کے لئے ایک عدل قائم کرنے والی امت بنایا تاکہ دنیا کے لئے تم ایک گواہ عادل کی حیثیت سے شہادت دے سکو خود قرآن مجید بھی اس معنی کی تائید کرتا ہے ایک موقع پر فرمایا کہ قال اوسطھم اور وہاں بلا اختلاف اوسطھم سے مراد اعدلھم ہی ہے - امام رازی نے بروایت قفال ایک حدیث بھی درج کی ہے کہ آنحضرت نے خود اس آیت کی تفسیر یوں فرمائی :-

امۃ وسطا ای عدلا اس کے علاوہ مشہور حدیث خیر الامور اوسطھا میں بھی اوسط یعنی اعدل استعمال کیا گیا ہے یعنی بہتر کام وہ ہیں جو ان میں مطابق عدل ہوں - آنحضرت کی نسبت کہا جاتا تھا کہ اوسط قریش نسبا اور یہاں بھی ظاہر ہے کہ اوسط اعدل ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور اسی بناء پر اس آیت سے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے کہ جب امت کی عدالت نص سے ثابت ہو گئی تو اس کا

اجماع یقیناً گمراہی وفساد سے محفوظ ہوگا۔

پہلی اور دوسری آیت میں تطبیق :-

پہلی اور دوسری دونوں آیتوں میں خدائے تعالیٰ نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فرض کا ذکر کیا ہے۔ لیکن آیت میں بظاہر الفاظ تمام امت کے لئے نہیں بلکہ امت میں سے ایک جماعت خاص کے لئے اس کا فرض ہونا معلوم ہوتا ہے:۔

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویأمرون بالمعروف الخ:۔

"تم میں سے ایک جماعت ہونی چاہیئے جو خیر کی طرف بلائے اور نیکی کا حکم دے"

لیکن دوسری آیت میں کسی ایک جماعت کی تخصیص نہیں ہے تمام امت کا امتیاز ملّی اس فرض کو قرار دیا ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف الخ "تم سب میں بہتر امت ہو اس لئے کہ نیکی کا حکم دیتے ہو الخ"

دونوں آیتیں ایک ہی سورہ اور ایک ہی رکوع میں ہیں۔ پھر دونوں میں اختلاف۔ پہلی میں یہ فرض محدود اور مخصوص اور دوسری میں عام ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ پہلی آیت میں خدا تعالیٰ نے جن فرائض کا ذکر کیا ہے (اُن) میں سے ہر فرض اپنی تکمیل کے لئے علم کا محتاج ہے۔ دعوت الی الخیر کے لئے ضرور ہے کہ اعمال خیر کا علم ہو۔

امر بالمعروف کیونکر انجام پاسکے گا جبکہ وہ کام معلوم نہ ہونگے جن پر معروف کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

نہی عن المنکر تو اور زیادہ علم وفضل اور درس وتدریس کا محتاج ہے کیونکہ منکرات میں تمام محرمات ومکروہات فقہیہ داخل ہیں اور جب تک ان کا علم نہ ہو کیونکر اسے روکا جاسکتا ہے۔

اسی تفسیر کی بناء پر فیصلہ کرلیا گیا ہے کہ اس آیت ولتکن منکم میں من تبعیض کے لئے آیا ہے۔ اُس سے صرف ایک گروہ محدود علماء مراد ہے اور یہ تینوں باتیں صرف اُنھیں کے فرائض میں داخل ہیں۔

علماء نے اس فرض عام کو صرف اپنے لئے مخصوص کرلیا۔

لیکن درحقیقت یہ خیال عملاً اور اعتقاداً ایک ایسی خطرناک غلطی ہے جس کو نہیں سمجھتا کہ کن لفظوں سے تعبیر کردوں اس تیرہ سو برس میں اسلام کو اُن تمام غلط فہمیوں سے سابقہ پڑا جو اس سے پہلے امم سابقہ کو پیش آچکی ہیں لیکن کسی سخت سے سخت تحریف نے بھی مسلمانوں کو ایسا لاعلاج نقصان نہیں پہونچایا جیسا اس غلطی سے پہونچا اور پہونچ رہا ہے۔

اسلام کی وہ دعوت الٰہی جو ایک عالمگیر اصلاح اور بین المللی جامعہ کے قیام کے لئے آئی تھی۔ اسی غلط فہمی سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ خلافت ونیابت الٰہی کا وہ شرف جو مسلمانوں کو عطا کیا گیا تھا

اور جس کی وجہ سے تحیثیت ملی وہ تمام عالم میں خدا کا مقدس دستِ عمل تھے۔ بدبختانہ اسی غلط فہمی سے خاک میں ملا۔ روسائے روحانی اور پیشوایان مذہب نے جو مشرکانہ اختیارات اپنے لئے مخصوص کر لئے تھے اور جن کی غلامی سے دنیا کو نجات دلانا اس دین الٰہی کا اصلی مشن تھا اُس کی بیڑیاں پھر اسی غلط فہمی کی لعنت سے مسلمانوں کے پاؤں میں پڑی ہیں اور ایسی پڑی ہیں کہ اب تک نہ نکل سکیں۔ چالیس کرور فرزندان الٰہی جن کو اپنے اعمال حسنہ سے دنیا میں خدا کی تقدیس کا تخت جلال بننا تھا آج اپنی بداعمالیوں سے تمام قومی جرائم اور ملی معاصی میں گرفتار ہیں اور قہر الٰہی کو مدت سے دعوت دے رہے ہیں۔ یہ وہ ہی معاصی ہیں جن کی پاداش میں اقوام گذشتہ سے خدا نے اپنا رشتہ توڑا تھا جن کی وجہ سے داؤد کے بنائے ہوئے ہیکل سے اُٹھ کر رحمت الٰہی نے اسمٰعیل کی چنی ہوئی دیواروں کو اپنا گھر بنایا تھا اور پھر جن کی وجہ سے بنی اسرائیل کو اپنی نیابت سے معزول کر کے مسلمانوں کو اُس پر سرفراز کیا تھا۔

ولقد اھلکنا القرون من قبلکم لما ظلموا و جائتھم رسلھم بالبینات فما کانو الیومنوا کذلک نجزی القوم المجرمین ثم جعلنا کم خلائف فی الارض من بعدھم لننظر کیف تعملون۔ ۱۰:۳۵

"اور تم سے پہلے کتنی قومیں گذر چکی ہیں کہ جب اُنھوں نے ظلم و معاصی پر

مگر باندھی تو ہم نے اُنھیں ہلاک کر دیا۔ اُن کے رسول کھلی نشانیاں لیکر آئے تھے مگر اُنھیں ایمان نصیب نہیں ہوا۔ مجرموں کو ہم ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر اُن کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے تم کو دنیا کی بادشاہت دیکر اُن کا جانشین بنایا تاکہ دیکھیں کہ کیسے عمل کرتے ہو۔ مگر یہ بدبختی بھی صرف اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کیونکر ہوا۔ اس طرح کہ اعتقاد ہی سے عمل وجود پذیر ہوتا ہے اس غلط فہمی کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ امر بالمعروف جو دراصل ہر فرد اسلامی کا فرض تھا اور صحابۂ کرام کی زندگی اس کی عملی شہادت ہمارے سامنے ہے۔ وہ روز بروز ایک محدود دائرہ میں سمٹتا گیا اور سمٹتے سمٹتے ایک غیر محسوس نقطہ بنکر رہ گیا۔ اب اُس کے وجود میں بھی شک ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب کے انحطاط و ہلاکت کی ایک بڑی علت روسائے مذہبی کا معبودانہ اقتدار ہے۔ اسلام نے اس زہر کا تریاق اس اصل اصول کو تجویز کیا تھا کہ امر بالمعروف کی خدمت کو اس طرح عام اور ہر فرد ملت پر پھیلا دیا جائے کہ پھر کسی مخصوص کو اس ذریعہ سے اقتدار حاصل کرنے کا موقع نہ ملے اور ہندوؤں کے برہمنوں اور عیسائیوں کے رومن کیتھولک فادروں کی طرح مذہبی دعوت و اصلاح کو کوئی جماعت اپنی اقلیم حکمرانی نہ بنائے کہ یفعل ما یشاء و یحکم ما یرید۔ لیکن اب صدیوں سے دیکھئے تو مسلمان جن بیڑیوں کو کاٹنے آئے تھے اُن سے خود اُن کے

پاؤں بوجھل ہو رہے ہیں۔ اس فرض الٰہی کو علماء نے اپنا موروثی حق بنا لیا ہے جس میں اور کسی فرد کو دخل دینے کی اجازت نہیں۔ شیطان اپنی قدیمی عادت کی طرح جب ضرورت دیکھتا ہے اُن کو اپنے اعمال ابلیسانہ کے لئے آلۂ کار بنا لیتا ہے۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جگہ امر بالمنکر و نہی عن المعروف کے فرائض اُن کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں۔ باقی تمام قوم اپنے اس فرض کی طرف سے غافل و بے خبر ہے اور جہل مذہبی کے سبب سے علماء کے اس غصب حقوق عامّہ پہ قانع ہو گئی ہے۔ خدا کی حکومت کوئی بھی اپنے اوپر محسوس نہیں کرتے۔ نیکیوں کی طرف سے سب کی آنکھیں بند ہیں اور برائیوں پر سے ہر شخص اس طرح گذر جاتا ہے گویا اُس کو کان سننے کے لئے اور آنکھیں دیکھنے کے لئے ملی ہی نہیں۔ فانھا لا تعمی الابصار و لکن تعمی القلوب الّتی فی الصدور۔ ۲۲:۶۴۔

دونوں آیتوں کا منشا ایک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دونوں آیتوں میں کوئی اختلاف نہیں دونوں کا منشا ایک ہے اور دونوں اس فرض کو بغیر کسی تخصیص و تحدید کے ہر قائل کلمۂ توحید کا فرض قرار دیتی ہیں۔ البتہ پہلی آیت میں ولتکن منکم کا لفظ اشتباہ پیدا کرتا ہے کہ منکم یہاں تبعیض کے لئے ہے۔

یعنی تم میں سے بعض لوگوں کی جماعت اس فرض کو اپنے ذمہ لے لے

لیکن چونکہ آگے چل کر دوسری آیت نے اس فرض میں تمام امت کو شامل کر لیا ہے اس لئے یہاں منکم کو تبعیض کے لئے قرار دینا ہی غلط ہے بلکہ وہ یقیناً توضیح و تبئین کے لئے آیا ہے۔ جیسا ہر زبان کے محاورہ میں عموماً بولا کرتے ہیں مثلاً عربی میں کہیں گے "للامیر من غلمانہ عسکر" ولفلان من اولادہ جندٌ یعنی امیر کے لڑکوں سے فوج کے سپاہی ہیں اور فلاں شخص کی اولاد سے لشکر مرتب ہو رہا ہے۔

تو اس سے امیر کے تمام لڑکے مراد ہونگے نہ کہ بعض۔ خود قرآن میں ایک موقع پر فرمایا کہ فاجتنبوا الرجس من الاوثان۔ ۲۲: ۳۱۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بتوں کے علاوہ اور کسی شئے کی ناپاکی سے پرہیز نہ کیا جائے غرضکہ یہاں من افادۂ معنیٔ تبئین کرتا ہے نہ کہ تبعیض۔ امام رازی نے دوسرے قول کو بیان کرتے ہوئے اس پر کافی بحث کی ہے۔ فمن شاء التفصیل فلیرجع الیہ جلد ۲: ۲۲۸۔

لیکن اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ہم قرآن شریف کی ایک اور آیت کو اس مضمون کے متعلق پیش کرتے ہیں۔ اگر امام رازی نے اس آیت کو بھی پیش نظر رکھا ہوتا تو ان کو متعدد آرا ر توجیہات کے لاحاصل نقل کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ سورۂ حج کے پانچویں رکوع میں خدائے تعالیٰ نے کافروں کے ان مظالم کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے آغاز اسلام کے مسلمانوں کو سامنا

ہوا تھا۔ پھر دفاع و حفظ نفس کے لئے قتال کی اجازت دی ہے اور اس کے بعد کہا ہے :۔

الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ و امروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور۔

" اگر ہم ان مظلوم مسلمانوں کو حکومت اور خلافت دیکر زمین میں قائم کر دیں تو وہ نہایت اچھے کام انجام دینگے یعنی نماز پڑھیں گے زکوۃ دینگے اور برائی سے روکیں گے اور سب کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

یہ آیت اس بارہ میں بالکل صاف اور فیصلہ کن ہے۔ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیاب کرنے کی علت یہ بیان کی ہے کہ وہ زمین پہ حکمراں ہونے کے بعد اچھے اور نیک کاموں کو انجام دیں گے۔ پھر ان کاموں کی بالترتیب تشریح کی ہے اور سب کو مسلسل عطف کے ساتھ بیان کیا ہے جو معطوف اور معطوف علیہ میں تسویہ ثابت کرتا ہے۔ پہلے نماز کا ذکر کیا۔ پھر زکوٰۃ کا اور یہ دونوں عمل ہر جگہ قرآن میں ایک ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

اس کے بعد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نام آیا ہے اور اسی سلسلہ اعمال میں جس میں نماز اور زکوۃ بہ لہجہ وجوب و فرض بیان کئے جاتے ہیں اس سے ثابت ہو گیا کہ :۔

(۱) مسلمانوں کو جو نصرت و فتح اور دنیا میں کامیابی عطا فرمائی اُس کی علت یہ تھی کہ تاکہ وہ اعمال حسنہ انجام دیں۔

(۲) وہ اعمال حسنہ علی الخصوص قیام نماز ادائے زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہیں۔

(۳) نماز اور زکوٰۃ ہر مسلمان پر فرض ہے۔ پس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ہر مسلمان کے فرائض میں داخل ہے۔

امر بالمعروف

عمل و اعتقاد۔

گو یہ محقق ہو چکا کہ اسلام نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنے ہر پیرو پر فرض کر دیا ہے۔ لیکن اصل بحث ابھی باقی ہے۔ ایسی تعلیم کو اصولاً اور اعتقاداً کون نہیں مانتا۔ لیکن اخلاق و مذہب کی ہر تعلیم میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اعتقاد اور عمل دو مختلف چیزیں ہیں جو اصول قابل عمل نہ ہو وہ کاغذ کے صفحوں پر کتنا ہی دلفریب ہو مگر انسانی مصائب کے لئے کیا مفید ہو سکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ دنیا اس اصول پر عمل بھی کر سکتی ہے یا نہیں۔

اسلام یکسر عمل ہے مذہبی تاریخ میں جو انقلابات ذہنی اصول سے

عمل کے مخالف ہوئے ہیں اور جن کی ابتدائی حالت کا مکمل نمونہ گوتم بدھ اور آخری صورت مسیحی تحریک تھی۔ اسلام اس کے انقلاب آخری کا نام ہے جس کے بعد مذہب ایک خالص عملی قانون کی شکل میں مبدل ہوگیا اور وہ تمام چیزیں نکل گئیں جو اُس کی عملی طاقت کو مضرت پہونچاتی تھیں پس اگر یہ صحیح ہے کہ امر بالمعروف ایک اسلامی اصول ہے تو یہ بھی صحیح ہے کہ وہ محض ایک ذہنی زندگی رکھنے والا اصول ہی نہیں بلکہ انسانی عملی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے والا قانون ہے۔

حب و بغض، عفو و انتقام۔

سب سے بڑی مشکل جو اس اصول کو عملی راہ میں پیش آتی ہے وہ اخلاقی تعلیمات کی دو رنگی ہے۔ ایک طرف عفو و درگذر اور محبت و عاجزی کی تعلیم ہے۔ دوسری طرف نیکی و بدی کے احتساب کی سختی اور انتقام وعقوبت ہے۔ خود قرآن کریم کی تعلیمات میں بھی مشکل پیش آتی ہے۔ ایک طرف عفو و نرمی اور حکمت و موعظت کا حکم ہے۔ دوسری طرف سختی و انتقام اور تشدد و جبر کے احکام پر زور دیا گیا ہے۔ یورپ کے مورخین جب تعصب و جہل کی تاریکی میں اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس اختلاف تعلیم کی تہہ میں انھیں کچھ نظر نہیں آتا پھر پریشان ہوکر اس اختلاف کو مکی اور مدنی زندگی کے اختلاف حالت کا نتیجہ بتلاتے ہیں کہ جب تک اسلام بے بسی اور محتاجی کی

حالت میں تھا نرمی اور عفو و درگذر کی تعلیم سے زندگی کا بہانہ ڈھونڈھتا تھا لیکن مدینہ میں آکر جب تلوار ہاتھ آگئی تو پھر حکومت اور طاقت کی حالت میں عاجزی اور مسکینیت کی ضرورت نہ تھی لیکن واللہ یعلم انھم لکاذبون۔

عفو و انتقام کا اصل اصول۔

اس بحث کا یہ موقع نہیں لیکن اسلام نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو جن اصول پر قائم کیا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

فقہا کا ایک عمدہ اصول ہے کہ اصل ہر شے کی اباحت ہے تا آنکہ کوئی سبب حرمت پیدا نہ ہو انگور کا عرق فی نفسہ ایک مفید اور عمدہ شے ہے لیکن جب اس میں نشہ پیدا کر دیا جائے اور نشہ کی وجہ سے انسان کے دماغ اور اخلاق کو نقصان دے اور اس نقصان کی وجہ سے امن عامہ میں خلل اور سوسائٹی کا حرج ہو تو وہ پھر حرام قطعی ہے۔

بالکل اسی طرح اخلاق میں بھی اصل عمل محبت ہے تا آنکہ کوئی سبب لاحق ہو کر بغض سے تبدیل نہ کر دے یعنی دنیا میں ہر شے محبت کے زیر قانون ہے اور کوئی نہیں جو محبت و پیار کا مستحق نہ ہو لیکن اس محبت کے اوپر بھی ایک قانون عام کی حکومت ہے یعنی نفع رسانی اور حقوق العباد کی نگہداشت پس اگر کوئی علت السیئی پیدا ہو جائے

جس کے سبب سے محبت کی صورت اپنی محبوبیت کو مسخ کر دے تو پھر ہر شے کو اپنی نظروں میں مبغوض بنالو اور جس قدر محبت کی راہ میں محبت کا جوش رکھتے تھے محبت ہی کی خاطر بغض کی راہ میں بغض کا جوش ظاہر کرو۔

غور کرو قانون دنیا میں کیا چاہتا ہے محبت یعنی امن کو قائم کرنا لیکن محبت کی خاطر عداوت اور امن کی خاطر بدامنی اس کو بھی کرنی ہی پڑتی ہے اس کی انتہائی آرزو یہ ہے کہ انسان کی زندگی کو مہلکات سے نجات دے لیکن زندگی بخشنے کے لئے اُسے موت ہی کے حربہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ انسانوں کو پھانسی پر چڑھا کر مارتا ہے اور کہتا یہ ہے کہ۔ یہ اس لئے ہے کہ تاکہ انسان گلا گھونٹ کر نہ مارے جائیں۔

پارلیمنٹ اور جمہوریت امن اور آزادی مانگتی ہے مگر امن کی خاطر اُسے شخصی حکومت میں بدامنی پیدا کرنی پڑتی ہے اور آئندہ قتل روک دینے کے لئے بہتوں کو قتل کرنا پڑتا ہے۔

قرآن نے حب و بغض اور نرمی و سختی کے اصول کو اسی بنیاد پہ قائم کیا ہے اس کی عام تعلیم یہ ہے

خذ العفو وأمر بالمعروف واعرض عن الجاهلین واما ینزغنك من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ انه سمیع علیم۔

"خطاؤں سے درگذر کر اچھی باتوں کا حکم دے اور جاہلوں سے کنارہ کش

ہو جا۔ اور اگر اے پیغمبر تیرے دل میں انتقام اور بدلہ لینے کا ولولہ پیدا ہو تو خدا سے پناہ مانگ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

ایک دوسرے موقع پر احسان عام اور عاجزی و فروتنی کو اس پیرایہ میں فرمایا۔

ولا تمش فی الارض مرحا انک لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولا کل ذلک کان سیئہ عند ربک مکروھا ۱۷: ۴۰۔

سورۂ فرقان میں اپنے نیک بندوں اور سچے مومنوں کی جہاں خصلتیں گنائی ہیں وہاں پہلا وصف یہ لکھا:۔

وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما ۲۵: ۶۵

اور رحم کرنے والے خدا کے رحم طینت بندے وہ ہیں جو زمین پر نہایت فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں۔ اور جب جاہل اُن سے جہالت کی باتیں کرتے ہیں تو سلام کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔

سورہ شوریٰ میں ایک ایسے ہی موقع پر مومن کا سب سے بڑا وصف یہ قرار دیا ہے کہ:۔

اذا ما غضبوا ھم یغفرون ۔ ۴۱: ۳۷ اور جب اُن کو غصہ آجاتا ہے

توخطاؤں سے درگذر کرتے ہیں"۔

قرآن میں "عزم امور" ایک انتہائی وصف ہے جو انبیائے جلیل القدر کی مدح میں آیا ہے۔ لیکن عفو اور صبر کرنے والے کے لئے بھی اسی کو استعمال کیا۔

ولمن صبر و غفر ان ذلک لمن عزم الامور ۴۲:۴۳ "اور جو صبر کرے اور خطاؤں کو بخشدے تو بیشک یہ بڑی ہمّت کے کام ہیں"۔

احسان عام کی ان تعلیمات کا استقصار کیا جائے تو اس طرح کی بیسیوں آیتیں اور ملیں گی۔

یہ تعلیم تو عام اور گویا اصل اخلاق کا حکم رکھتی ہے لیکن جب عوارض سے حالات متغیر ہو جائیں اور عفو و درگذر کی جو علت تھی یعنی نفع خلائق اور عدم مضرت رسانی عفو و درگذر سے خود وہ مفقود ہونے لگے تو اس حالت میں پھر شرائط عدل و وسطیت نے انتقام اور بدلے کی سختی کو جائز کر دیا۔

جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا۔ "برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی سے کرو" آگے چل کر اُس کو صاف کر دیا۔

ولمن انتصر بعد ظلمہ فاولٰئک ما علیھم من سبیل انما السبیل علی الذین یظلمون الناس ویبغون علی الارض بغیر الحق ۴۲:۳۹

"اور اگر کسی پر ظلم ہوا ہو اور وہ اُس کے بعد بدلہ لے تو ایسے لوگ معذور ہیں

ان پر کوئی الزام نہیں۔ جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں بغیر کسی حق کے زیادتی کے ساتھ پیش آتے ہیں"۔

دوسری مثال اس سے زیادہ واضح ہے۔

عام حکم کفار و مخالفین کے ساتھ نرمی و رافت عفو درگذر اور بطریق احسن نصیحت و موعظت کا ہے۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن ۱۶: ۱۲۷

"خدا کی راہ کی طرف حکمت و وعظ کے ساتھ بلاؤ اور اگر بحث بھی کرو تو وہ اس طرح کہ وہ پسندیدہ طریقہ ہو"۔

دوسری جگہ مخصوص طور پر یہود و نصاریٰ کی نسبت کہا۔

ولا تجادلوا اھل الکتاب الا بالتی ھی احسن ۲۹: ۴۵ "اہل کتاب کے ساتھ بحث نہ کرو مگر بہ طریق پسندیدہ"۔

لیکن پھر دوسرے موقعوں پر جہاد فی سبیل اللہ کو ایک فرض دین قرار دیا اور سورتوں کی سورتیں اس کے احکام کی نسبت نازل فرمائیں۔

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ۔۲: ۱۸۷ "جو لوگ تم سے لڑیں تم بھی اللہ کی راہ میں اُن سے قتال کرو"۔

اسی آیت کے بعد فرمایا۔

فاقتلوھم حیث ثقفتموھم واخرجوھم من حیث اخرجوکم۔ ۲: ۱۸۸۔

"ان کو جہاں پاؤ قتل کرو اور جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے تم بھی انھیں نکال باہر کرو۔"

پہلے عام طور پر نرمی اور آشتی کا حکم دیا تھا لیکن قتل پر بھی بس نہ کرکے ایسا شدید طریقے سے سختی پر زور دیا۔ حیث قال قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا فیکم غلظۃ۔

"اپنے آس پاس کے کافروں سے لڑو اور چاہیئے کہ وہ تم میں سختی پائیں۔"

دونوں تعلیموں میں کس درجہ تباین وتباعد ہے مگر دراصل دونوں کا منشا ایک ہی ہے۔ پہلا حکم احسان عام، محبت عمومی، اور اصل اخلاق پر مبنی تھا۔ لیکن جب عوارض و لواحق سے حالات بدل گئے تو جس طرح پہلے انسانوں کی راحت اور طلب نفع کے لئے نرمی کا حکم دیا تھا اسی طرح اور اسی مقصد سے یہاں سختی اور قتل کا حکم دیا اور اس کی علت کو کھول کر بیان کر دیا کہ

الفتنۃ اشد من القتل۔

"فساد خونریزی سے بڑھ کر برائی ہے۔"

وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ ۲: ۱۸۹۔

"ان کو قتل کرو یہاں تک کہ ملک میں فساد باقی نہ رہے۔"

جس طرح قانون قتل کی برائی کو روکنے کے لئے خود قتل کی برائی کو مجبوراً اختیار کرتا ہے اسی طرح قرآن نے فتنہ و فساد سے ارض الٰہی کو پاک کرنے کے لئے تلوار سے مدد لینے تک کی اجازت دیدی ہے۔ بے شک نرمی اور نرم رفتاری کو خداوند عالم دوست رکھتا ہے لیکن سخت گیروں اور ظالمین کو سختی سے باز رکھنے کے لئے جب تک سختی نہ کی جائے نرمی قائم نہیں ہو سکتی فتنہ و فساد اُسے پسند نہیں۔ مگر فتنہ و فساد کو روکنے ہی کے لئے اُسے فتنہ سے علاج بالمثل کرنا پڑتا ہے۔

ولولا دفع اللہ الناس بعضہم ببعض لہدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیہا اسم اللہ کثیرا۔ ۲۲:۴۲۔

"اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ سے نہ ہٹواتا رہتا تو تمام صومعے اور گرجے اور تمام عبادتگاہیں اور مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے کبھی کی منہدم ہوگئی ہوتیں"۔

یعنی مقصد الٰہی مشفقت و احسان عام ہے لیکن جب ایک گروہ اُسکی زمین کو فتنہ و فساد سے آلودہ کرتا ہے بغیر کسی جرم کے محض عبادت الٰہی کی وجہ سے اُس کے نیک بندوں پر ظلم و سختی کرتا ہے اُن کو گھروں سے نکالتا ہے اللہ کی عبادت گاہ میں جانے سے روکتا ہے پھر جب وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر وطن سے بے وطن ہوکر

ایک دوسرے شہر میں پناہ لیتے ہیں تو وہاں بھی اُن کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا - تو ان حالتوں میں مجبور ہو کر پیغمبر کو فتنہ روکنے، مظلوموں کو بچانے، شعائر الٰہی کی حفاظت اور حرمت کو قائم رکھنے اور رافت و رحمت سے دنیا کی محرومی کو مٹانے کے لئے سختی سے کام لینا پڑتا ہے اور تلوار کو کاٹنے کے لئے تلوار بلند کی جاتی ہے۔

وکذٰلک جعلناکم امۃ وسطا۔

اس موقع پر پچھلے نمبر کے اُس ٹکڑے پر ایک نظر ڈال لینی چاہئے جس میں "امۃ وسطا" پر بحث کی گئی ہے۔ خدائے تعالےٰ نے مسلمانوں کو اپنی خلافت و نیابت بخشی تھی پس ضرور تھا کہ وہ بھی صفات الٰہی سے متصف اور متخلق باخلاق الٰہی ہوں۔ خدا رحیم و محبت کرنے والا ہے پس حکم دیا گیا کہ ارحموا علی الارض یرحمکم من فی السماء زمین پر رحم کرو تاکہ وہ جو آسمان پر ہے تم پر رحم کرے لیکن رحیم ہونے کے ساتھ وہ عادل بھی ہے پس رحم و محبت میں بھی عادل و وسط کا ہونا ناگزیر تھا اس بنا پر تعلیم دی گئی کہ جب افراط و تفریط حد سے بڑھ جائے تو افراط کو روکنے کے لئے تم بھی افراط کرو۔ صفرا بڑھ گیا ہے تو تم بھی بہت زیادہ ترشی کھلا دو۔ تم پر تلوار اُٹھائی گئی ہے تو اسے تلوار ہی سے کاٹو۔ تم ذلیل کئے گئے ہو

تو تم بھی ذلیل ہی کرو تاکہ تسویہ و اعتدال پیدا ہو۔ یہ سب کچھ عین رحم و محبت ہے نہ کہ سختی و جبر۔ ڈاکٹر مریض کے عزیز سے کم مریض پہ مہربان نہیں۔ اس کے تلوے میں کانٹا چبھکر چبھن پیدا کر رہا ہے لیکن اس چبھن کے دور کرنے کے لئے نشتر کی نوک کی چبھن ہی سے اسے کام لینا پڑے گا۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات و انزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط۔ و انزلنا الحدید فیہ باس شدید و منافع للناس۔ ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ مبعوث کیا اور اُن کے ساتھ کتاب و ترازو بھیجی تاکہ لوگ عدل و انصاف پہ قائم ہوں اور نیز لوہا پیدا کیا جو ہتھیاروں کی شکل میں سخت خطرناک بھی ہے اور ساتھ ہی بہت سی منفعتیں بھی انسانوں کے لئے اپنے اندر رکھتا ہے۔

اس آیت میں قرآن نے پوری تشریح کے ساتھ نظام عالم کے قوانین اساسی کو بیان کر دیا ہے۔ خدا ہدایت و اصلاح کے لئے انبیاء کو بھیجتا ہے اور ان کو میزان قیام عدل کی ناقدانہ قوت دیتا ہے تاکہ دنیا میں اللہ کے عدل کو قائم کر دیں۔ لیکن چونکہ اس کے لئے اکثر اوقات قہر و عقوبت کی ضرورت تھی اس لئے ان کو عدل قائم کرنے کے لئے

جنگ و قتال کی بھی اجازت دی اور لوہا پیدا کیا جو طرح طرح کے ہتھیاروں کے اشکال اختیار کرتا ہے پس وہ مضر بھی ہے اور مفید بھی۔

تشبہ باللہ و تخلق باخلاق اللہ۔

پس امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی صفات الٰہیہ میں سے ایک صفت ہے۔ اسلام انسان کے آگے ایک ارتقائے روحانی کی راہ کھولتا ہے جو گو عبدیت کے مقام تذلل و تنکر سے شروع ہوتی ہے مگر اس کا انتہائی نقطہ تشبہ باللہ یعنی خدا کی صفات سے مشابہت پیدا کرنے کا مقام ہے اور اسی طرف اس مشہور حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے کہ تخلقوا باخلاق اللہ خدا کا اخلاق اپنے اندر پیدا کرو پس ضرور تھا کہ جس ملت کو خدا نے دنیا میں اپنی خلافت و نیابت بخشی تھی وہ بھی اس صفت الٰہی سے متصف ہوتی۔ خدا طاعت و عبادت سے یعنی ہر ایسے کام سے جو قوائے فطریہ کا صحیح استعمال ہو خوش ہوتا ہے پس ایک انسان مومن کو بھی خوش ہونا چاہئے۔ خدا کفر و ضلالت اور بداعمالی سے یعنی ان تمام کاموں سے جو قوائے فطریہ کا اسراف و تبذیر ہو ناخوش ہوتا ہے اور اپنی نارضامندی کا اظہار کرتا ہے پس مومن و مسلم کو بھی ناخوش ہونا چاہئے اور اپنی نارضامندی کا اعلان کرنا چاہئے۔ ہم نے پچھلے مقالہ و نمبر ۲ میں

اسراف وتبذیر کی حقیقت سے بحث کی تھی۔ خدا عادل ہے اور رحم ومحبت نرمی و
آشتی میں بھی اسراف و تبذیر پسند نہیں کرتا۔ اگر بائبل کا ابن العبد رحم محض
کا مجسمہ ہے اور عدل کی ترازو کو ہاتھ میں لینا نہیں چاہتا تو نہ لے مگر چھوئے
بغیر تو اسے بھی چارہ نہیں تمام انسانی جرائم و معاصی کو شان محبت کے جوش
میں معاف کر دینا چاہا لیکن پھر بھی بدی کو قابل عقوبت ثابت کرنے کے
لئے تمام ابن آدم کو نہ سہی مگر اپنے عزیز بیٹے کو تو تین دن تک لعنت میں
گرفتار رکھ کر خونی مجرموں کی طرح سولی پر چڑھانا ہی پڑا۔

یہ ناگزیر ہے کہ دنیا کے لئے محبت کی صورت موہنی ہو مگر
افسوس کہ سود مند نہیں۔ عدل کی پیشانی پر اگرچہ خوش نمائی کی
بلندی کی جگہ سختی و خشونت کی لکیریں ہیں۔ لیکن دنیا کا تمام نظام
صرف اسی کے دم سے ہے پس خدائے تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو
کو بھی اپنی صفات کی دعوت دی اور اپنی شان عدل کی طرح اس
کبھی امۃ وسطا قرار دیا تاکہ وہ اس کی زمین پر ایک عادلانہ
خلافت اور اس کی طرح کسی جذبہ میں نہ تو اسراف کرے یعنی
رحم کے موقع پر رحم کو اور سختی کے موقع پر سختی کو اس کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا
اور نہ تبذیر کا طریقہ اختیار کرے یعنی رحم کی جگہ قہر اور قہر کی جگہ رحم۔

مقام محبت الٰہی یحبھم ویحبونہ۔

یہی راز ہے کہ خدا نے تمام اقوام کو اپنے اپنے دور میں اپنی خلافت بخشی اور ہر صالح جماعت کو اس ورثۂ الٰہی کا حقدار بنایا ان الارض یرثھا عبادی الصالحون مگر کسی کو اپنی محبوبیت اور معشوقیت کا درجہ عطا نہیں فرمایا حضرت داؤد علیٰ نبینا و علیہ السلام کی نسبت ضرور کہا کہ یا داؤد انا جعلنٰک خلیفۃ فی الارض ۳۸ : ۲۶ "اے داؤد ہم نے زمین پر تم کو اپنی خلافت بخشی۔ بنی اسرائیل بھی مدتوں اس پر سرفراز رہے لیکن ان کی نسبت یہ کہیں نہیں کہا کہ خدا کے دوست اور محبوب بنائے گئے اس امت مرحوم پر مزید خصوصیت تھی کہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ ۵ : ۵۹۔ عنقریب اللہ ایک ایسا گروہ پیدا کریگا جن کو وہ اپنا محبوب بنائیگا۔ اور وہ خدا کو محبوب رکھیں گے" لیکن اس جماعت کی یہ علامت بتائی گئی کہ اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم ۵ : ۶۰ "مومنوں کے ساتھ نرم مگر کافروں کے ساتھ سخت اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑا دیں گے۔ اور کسی ملامت کرنیوالے کی ملامت سے خوف نہ کھائیں گے" یہ مختصر آیت اس مشکل کا پورا حل ہے۔ مومن محبوب الٰہی ہے کیونکہ ایمان باللہ سے بڑھ کر اور کون سی شے حاصل ہو سکتی ہے؟ لیکن خدا نے اپنی محبت کے ساتھ طرف مقابل کی محبت کا بھی ذکر کیا کہ میں انھیں چاہتا ہوں اور وہ مجھے چاہتے ہیں (یحبھم ویحبونہ

محبت کی شرط اولین فنا فی المحبوب ہے۔

اس لئے مومن مخلص بھی وہی ہے جو اپنی تمام خواہشوں اور قوتوں کو بھول کر صرف خدا کی مرضی و ارادہ پر اپنے تئیں چھوڑ دے۔ خدا کی مرضی اس کی مرضی اور خدا کی خوشی اس کی خوشی ہو یہی معنی خلافت الٰہی کے ہیں کہ وہ دنیا میں اللہ کی صفات کاملہ کا مظہر ہے اور اس لئے اس کا جانشین الحب فی اللہ والبغض فی اللہ پس جب مقام ایمان محبت الٰہی ہے اور محبت بغیر حصول فنا فی المحبوب محال ہے۔ یہیں سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض بے نقاب ہو جاتا ہے۔ مومن کی یہ تعریف ہوئی کہ اس کی نہ کسی کے ساتھ دوستی ہو اور نہ دشمنی۔ نہ کسی کی مدح کرے اور نہ مذمت بلکہ وہ دست الٰہی میں ایک بیجان آلہ بنکر اپنی محبت و دشمنی کو راہ محبوب کے لئے وقف کر دے۔ جو خدا کے دوست ہیں وہ اس کے دوست ہوں اور جو اُس کے دشمن ہیں وہ اس کے دشمن۔ اسی کی راہ میں دوستی اُسی کی راہ میں دشمنی۔

الحب فی اللہ البغض فی اللہ

خدا نیکی اور اعمال حسنہ سے خوش ہوتا ہے پس یہ بھی جہاں کہیں نیکی کو دیکھے اپنا سر جھکا دے۔ وہ بدی اور بداعمالی پر غضبناک ہوتا ہے لا یرضی لعبادہ الکفر پس اس کو بھی جہاں کہیں بدی نظر آئے صفات الٰہی کی چادر اوڑھ کر قہر مجسم بن جائے اذلۃ علی المؤمنین

اعزة علی الکافرین۔ نیکی کے سامنے جس قدر عاجز اتنا ہی بدی کے آگے مغرور اور سخت ہو۔



فہرست رسائل امامیہ مشن رجسٹرڈ لکھنو

نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	خرچ ڈاک	نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	خرچ ڈاک
۱	قاتلان حسین کا مذہب	۰۴ر	۱ر	۲۱	اسوۂ حسینی	۰۶ر	۱ر
۲	تحریف قرآن کی حقیقت (ختم)	۰۶ر	۱ر	۲۲	جنگ صفین	۳ر	۲ر
۳	مولود کعبہ "	۱ر	۲ر	۲۳	تذکرہ حفاظ شیعہ حصہ اول	۰۶ر	۱ر
۴	وجود حجت	۰۴ر	۱ر	۲۴	" " " حصہ دوم	۰۵ر	۱ر
۵	اصول دین اور قرآن	۰۴ر	۱ر	۲۵	مقصود کعبہ	۱ر	۲ر
۶	اتحاد الفریقین حصہ اول	۰۴ر	۱ر	۲۶	مذہب باب و بہا حصہ دوم	۹ر	۱ر
۷	حسین اور اسلام (اردو)	۱۰ر	۲ر	۲۷	مذہب اور سائنس	۱ر	۲ر
۸	" " (ہندی)	۱۰ر	۲ر	۲۸	معرکۂ کربلا	ختم	
۹	" " (انگریزی)	ختم		۲۹	کربلا کا مہا یدھ (ہندی)	"	
۱۰	متعہ اور اسلام	۹ر	۲ر	۳۰	دی ٹریجڈی آف کربلا (انگریزی)	۲ر	۲ر
۱۱	امامت ائمہ اثنا عشر اور قرآن	۰ر	۲ر	۳۱	اسلام کی حکیمانہ زندگی	۹ر	۱ر
۱۲	تجارت اور اسلام (ختم)	۳ر	۱ر	۳۲	دور استبداد	۰۴ر	۱ر
۱۳	اتحاد الفریقین حصہ دوم (")	۰۴ر	۱ر	۳۳	حقیقت بدار	۳ر	۲ر
۱۴	علی اور کعبہ	۱ر	۲ر	۳۴	خطیب آل محمدؐ	۰۴ر	۱ر
۱۵	رجال بخاری حصہ اول	۰۶ر	۱ر	۳۵	تدوین حدیث	۱ر	۲ر
۱۶	مذہب باب و بہا حصہ اول	۰۵ر	۱ر	۳۶	مطلوب کعبہ	۱ر	۲ر
۱۷	نوروز و غدیر	۱ر	۲ر	۳۷	معارکۂ کربلا	۳ر	۲ر
۱۸	مجاہدۂ کربلا	۲ر	۲ر	۳۸	اسلام کا پیغام (اردو)	۰	۲ر
۱۹	کربلا کا آتم بلیدان (ہندی)		ختم	۳۹	دی مسیج آف اسلام (انگریزی)	۰	۲ر
۲۰	دی مارٹیڈم آف حسین	۳ر	۱ر	۴۰	اثبات عزاداری	۰۴ر	۱ر

۴۱	مسئلہ فدک	۰۵ر	۱ر	۵۱	مشہد اعظم	۱ر
۴۲	تاجدار کعبہ	۱ر	۱ر	۵۲	لا تفسدوا فی الارض	۸ر
۴۳	خلافت و امامت حصہ اول	۰۵ر	۱ر	۵۳	نہج البلاغہ کا استناد	۴ر
۴۴	" " حصہ دوم	۰۴ر	۱ر	۵۴	خلافت و امامت حصہ چہارم	۳ر
۴۵	" " حصہ سوم	۰۴ر	۱ر	۵۵	شہدائے کربلا حصہ دوم	۰۵ر
۴۶	تحقیق اذان	۱ر	ر	۵۶	ابو الائمہ کے تعلیمات	۴ر
۴۷	ذوالجناح	ر	ر	۵۷	حسین کا پیغام عالم انسانیت کے نام	۱ر
۴۸	شہدائے کربلا	۴ر	۱ر	۵۸	اسلامی عقائد	۲ر
۴۹	کربلا کا مہاسمر (ہندی)	۲ر	ر	۵۹	آثار باقیہ	زیر طبع
۵۰	حسین ان دی لیبن آف کربلا	۰۱ر	ر	۶۰	صحیفہ سجادیہ کی عظمت	ر
۶۱	خلافت و امامت حصہ پنجم				زیر طبع	

فہرست کتب امامیہ مشن پاکستان

نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	خرچہ ڈاک	نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت
۱	حسین دی مارٹر (انگریزی)	ختم		۸	رسول کی بیٹی	۲ر
۲	الشہید	۱۰ر	۱ر	۹	گل عصمت	۱۰ر
۳	کائنات قبل از اسلام	۲ر	ر	۱۰	رجال بخاری حصہ دوم	۶ر
۴	قاتلان حسین کی گرفتاری	۸ر	۲ر	۱۱	ڈیٹم زم اینڈ فری ول آف ملاحمید (انگریزی)	۸ر
۵	حج دینیات	۴ر	۲ر	۱۲	تاریخ ازدواج	۸ر
۶	ذخیرۃ الاحکام	۴ر	۱ر	۱۳	الہامی کلمات	۳ر
۷	صحیفہ تجلی (رعایتی)	۸ر	۱ر	۱۴	شہید اسلام	۴ر